ہماری ثقافت اور سیاست
کیا ہے اور کیا ہونی چاہئے

مؤلف
سید علی شرف الدین موسوی علی آبادی

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

بسم الله الرحمن الرحيم

ہماری ثقافت اور سیاست

کیا ہے اور کیا ہونی چاہئے

مؤلف

سید علی شرف الدین موسوی علی آبادی

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

۲-بی-۳/۵ ــــ ناظم آباد ــــ نمبر ۲ ــــ کراچی

نام کتاب.......... ہماری ثقافت اور سیاست کیا ہے اور کیا ہونی چاہیے

تالیف.......... سید علی شرف الدین موسوی علی آبادی

کمپوزنگ.......... سید محمد صادق شرف الدین

ناشر.......... دار الثقافۃ الاسلامیہ پاکستان

طبع اول.......... رجب المرجب ۱۴۲۰ھ

تمہید

(ثقافت' سیاست' اجتماعیات اور ہماری ذمہ داریاں)

ثقافتی' اجتماعی اور سیاسی ذمہ داریوں سے مراد ہے ان سرگرمیوں میں حصہ لینا' دوسروں کو صحیح سمت کی نشاندہی کرنا' انھیں صحیح راہ پر استوار کرنا اور ان سے متصادم و متضاد قوتوں کا مقابلہ کرنا۔ مذکرہ بالا تینوں عناصر' اقوام و ملل کی بقاو دوام کیلئے ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہیں۔

ان سرگرمیوں سے متعلق کسی قسم کی ذمہ داری قبول کرنے یا ان میں حصہ لینے کے متعلق تین مفروضے ہو سکتے ہیں :۔

(ا) ان سرگرمیوں پر ٹوٹ پڑیں' توڑ پھوڑ کریں کیونکہ تیز و تند ہواؤں کی پروا کیے بغیر' گرد و غبار اور آلودگیوں سے بے پروا ہو کر عملی اقدام کرنے والے ہی میدان جیت لیتے ہیں اور جو لوگ اپنے تئیں اسکالر گردانتے ہیں وہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ان میدانوں میں کودنے والے' خواہ کم پڑھے لکھے' ان پڑھ اور جاہل ہی کیوں نہ ہوں' آگے نکل جاتے ہیں۔ علم معاشیات و اقتصادیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والے حصول ملازمت کیلئے ٹھوکریں کھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس تگ و دو میں انکے جوتے گھس جاتے ہیں۔ جبکہ بہت سے ان پڑھ اور جاہل افراد' جوان تو جوان بوڑھے لوگ ریڑھیاں

لگا کر اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہوئے اطمینان و سکون سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

(۲) وسائل و ذرائع کے حامل افراد ان سرگرمیوں میں حصہ لے سکتے ہیں اور اس طرح ایک کردار ادا کر سکتے ہیں بالخصوص آج کے دور میں جو کہ ثقافتی یلغار کا دور ہے۔

وسیع و عریض الیکٹرانک میڈیا اور مصنوعی سیاروں وغیرہ کے ذریعہ ہماری مذہبی اور قومی ثقافت کو گھر کے اندر تک گھس کر پاش پاش کیا جا رہا ہے۔ بیوی کو شوہر سے لڑایا جا رہا ہے' اولاد کو والدین کے خلاف بغاوت پر اکسایا جا رہا ہے' حتی کہ علمائے دین کے اہل خانہ' بالخصوص ان کی اولاد کو اکسایا جا رہا ہے کہ اگر ہو سکے تو انکی زندگی ہی میں ورنہ بعد وفات مذہب کا مذاق اڑائیں۔ یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ جدید ترین وسائل ابلاغ پر اہل کفر و الحاد کا قبضہ ہے۔

میدان سیاست کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں۔ اس میدان میں بھی وہی لوگ مؤثر انداز میں حصہ لے سکتے ہیں جو ایک ایک ووٹ کو ہزاروں لاکھوں میں خریدنے کی قدرت رکھتے ہوں' ہزاروں لاکھوں روپے بے دریغ خرچ کر سکتے ہوں نہ کہ ڈاکٹریٹ اور پی ایچ ڈی کرنے والے۔ اسی طرح دفاع کے میدان میں بھی وسائل و ذرائع کا ہونا لازمی ہے ورنہ ہر وقت فنا ہو جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے' گرچہ ہمارے خیال میں اس وقت جدید ترین' مہلک ترین اسلحہ کا کردار بھی برائے نام ہی ہے۔ قوموں کی تباہی اور ہار جیت کا اصل فیصلہ مذاکرات کی میز پر ہی ہوتا ہے۔

(۳) تیسرا مفروضہ یہ ہے کہ قرآن کریم و سنت رسولؐ اور سیرت معصومینؑ پر

عمل کیا جائے جو کہ ہر قسم کے جھوٹ' تہمت اور غلط گوئی کی نجاست وقذارت سے پاک ہے۔

اس سلسلہ میں وارد آیات کریمہ کے علاوہ سنن مبارکہ معصومینؑ انکے اقوال وافعال اور تقریر(۱۰) کی صورت میں موجود ہیں۔ مزید بر آں اس میدان میں اپنی فہم وادراک کے مطابق قوت وتوانائی بذل کرنے والے نامور نابغۂ روزگار فقہائے کرام کے فتاویٰ موجود ہیں۔ ان آیات وروایات اور فتاویٰ میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں' فردی' اجتماعی' ثقافتی' سیاسی ہر ایک میں سے ایک نہ ایک حکم سب پر لاگو ہوتا ہے'۔ لہٰذا ہر شخص کسی بھی عمل کو ترک کرنے یا منتخب کرنے میں ان پانچ احکام :واجب' حرام' مستحب' کراہت اور مباح میں سے لازماً کسی ایک کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس فعل کے اثرات زیادہ ہوں اس کے احکام میں شدت وتاکید بھی زیادہ ہوتی ہے۔ انسانی زندگی میں سیاست وثقافت اور اجتماعیات کے اثرات اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ان سرگرمیوں میں حصہ لینا نہ لینا غالباً واجب اور حرام کے زمرے میں آتا ہوگا۔ البتہ کبھی کبھی اور مخصوص حالات میں مستحب وکراہت کی نوبت بھی آسکتی ہے۔

لہٰذا ہم میں سے ہر شخص اپنی قدرت وتوانائی کے مطابق ان تینوں پہلوؤں کے بارے میں کچھ نہ کچھ ذمہ داری رکھتا ہے۔ کوئی شخص خود کو خواہ کتنا ہی حقیر' فقیر اور بے بس گردانے اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا زندگی کے تمام نشیب وفراز اور حالات کی دگرگونی کے باوجود' باطل اور بڑی طاقتوں کو خاطر میں لائے بغیر اپنی ذمہ داری ادا کریں' خود کو قیام قیامت کے موقع پر' رب کریم' نبی برحق ائمہ طاہرینؑ کے سامنے جوابدہی کیلئے تیار رکھیں۔

۱۰۔ یعنی کسی معصوم کے حضور کسی شخص نے کوئی فعل انجام دیا ہو اور معصوم نے اس پر اعتراض نہ کیا ہو بلکہ خاموش رہے ہوں اسکو تقریر کہتے ہیں۔

اگر دوسروں کے پاس مادی وسائل وذرائع موجود ہیں یا مادہ سے حاصل شدہ افکار، فکروفریب نیرنگ موجود ہے تو کیا ہوا، ہماری منطق دین کی منطق ہے۔ اہل دین کو دین کی بات پہونچانے میں مایوس ونا امید نہیں ہونا چاہئے کیونکہ دین بذات خود ایک طاقت وقدرت رکھتا ہے۔ اگر مادی سرگرمیاں اور انکی طاقت اتنی زیادہ ہے کہ کھل کر انکا مقابلہ کرنا، انھیں شکست دینا مشکل نظر آتا ہو تو کم از کم انکے اسلام دشمن اقدامات میں کچھ نہ کچھ رکاوٹ تو ڈال سکتے ہیں، انکی رفتار کو کم کرسکتے ہیں، انکے لئے مشکلات کھڑی کرسکتے ہیں۔

ہمارے ملک عزیز پاکستان میں جابجا آپکو دین کا مظاہرہ نظر آئے گا۔ تاہم کہیں، کہیں دین فروش، ملک فروش اور دینی اصولوں کو چیلنج کرنے والے بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن جس قوم کے ذہن میں اس قدر دینی رجحان اور اقدار انسانی کا خیال وپاس ہے، دینی باتوں کو اگر صحیح فکروانداز میں دیکھنے والے مل جائیں تو خدا کے فضل سے امید ہے کہ انھیں بہت پذیرائی حاصل ہوگی۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم اپنے ملک میں ہونے والی ثقافتی، اجتماعی اور سیاسی سرگرمیوں کے سرخیل کارواں تو نہیں رہے لیکن یہ سرگرمیاں ہماری نظروں سے اوجھل بھی نہیں رہیں۔ لیکن نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کافی عرصہ گزر جانے کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ ان اداروں میں نہ ہمارا کوئی کردار ہے، نہ آواز۔ علاوہ بریں ہم ان کے اجلاسوں میں ہونے والی کارروائیوں اور سرگرمیوں سے دلی طور پر، مذہبی طور پر اتفاق نہیں کرتے تھے کیونکہ ہم اپنی فکر پر ایمان محکم اور یقین کامل رکھتے ہیں۔

اس ملک میں رہنے والے ہر شخص کو اپنے کردار وگفتار کو ان تین نکات کو سامنے رکھتے ہوئے متعین کرنا چاہئے۔

(۱) انفرادی اور شخصی سرگرمیاں۔

(۲) دینی اور مذہبی سرگرمیاں۔

(۳) ملکی اور علاقائی سرگرمیاں۔

جہاں تک میرا سوال ہے! الحمدللہ میں اپنی مسئولیت کو درک بھی کرتا ہوں اور اسے پورا کرنے کی حتی المقدور کوشش بھی کرتا ہوں۔

میں ایک شیعہ اثناء عشری ہوں۔ مکتب اہل بیت سے تعلق رکھتا ہوں۔ ممکن ہے اگر میں کہیں اور کسی ایسی جگہ زندگی بسر کروں جہاں پر یہاں کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ زندگی کی سہولتیں میسر آجائیں۔ لیکن میری شیعیت 'میرا مکتب فکر تو دامن اسلام میں 'مسلمان اجتماع میں ہی فروغ پائیگا۔ میرے مذہب کو تحفظ تو اسی میں حاصل ہوگا۔ میرے مذہب کی اصطلاح وسیع ہے۔ میرے مذہب کی اصطلاح کا مطلب یہ نہیں کہ سب کچھ چھوڑ کر صرف عزاداری ہی کو اپنالیں بلکہ یہ اصطلاح اس سے وسیع تر ہے۔ اس میں جمعہ وجماعت ہے' محرمات شریعت کا انسداد ہے' اخوت اور اسلامی برادری کا فروغ ہے' قرآن اور کعبہ کی عظمتوں کا اعتراف ہے۔ لہٰذا میرے مکتب کو صرف اسلام و مسلمین کے دامن میں ہی تحفظ حاصل ہو سکتا ہے' نہ کہ دامن کفر و شرک میں۔ لہٰذا مجھے اسلام کا خیال رکھنا تھا اور اسلامی اقدار کے فروغ کیلئے اسلامی وطن کی ضرورت تھی جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔ مجھے تشیع کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کا' کل امت اسلامی کے فائدہ اور نقصان کا خیال رکھنا تھا۔ چونکہ لیکن بدقسمتی سے جن چیزوں کا میں پاس رکھنا چاہتا تھا مجھے اس کے برخلاف ماحول کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مجھے دوسروں کی حرکتوں اور سرگرمیوں پر زبان کھولنے' قلم اٹھانے کا حق نہیں پہونچتا' ویسے یہ بات میری طینت کے بھی خلاف ہے تاوقتیکہ وہ مجھے اپنے لئے مخلص اور ناصح نہ سمجھیں۔ لہٰذا میں انکو قصوروار نہیں ٹھہراتا چاہے وہ کوئی بھی ہوں۔

ان تمام باتوں کے باوجود میں بحیثیت ایک شیعہ کے ان اجتماعات میں سرگرمی سے پیش پیش نہ سہی مگر شریک ضرور رہتا تھا۔ لیکن انمیں طے ہونے والی پالیسیوں سے اتفاق نہیں کرتا تھا' اپنے اختلاف نظر کو اندرون خانہ مناسب موقع پر پیش بھی کرتا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ سیکولر جماعتوں نے شیعہ قوم کے ووٹ حاصل

کرنے کے لئے اس کو دو غلط راہوں پر لگادیا:

(۱) ایک تو یہ کہ بے سوچے سمجھے 'قربۃً الی اللہ سمجھ کر حکومت کی مخالفت کرنا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض حکومتی حلقوں میں یہ تاثر پیدا ہو گیا کہ شیعہ ہونے کا مطلب ہے حکومت کی مخالفت جبکہ یہ فکر تشیع کے خلاف ہے۔ حسب فرمان امیر المومنین وائمہ طاہرینؑ 'شیعہ حکومت مخالف نہیں بلکہ حکومت کی بہتری کے خواہاں ہوتے ہیں۔

(۲) دوسرا یہ کہ غیر شعوری طور سے ایسی نادانیاں اور حماقتیں سرزد ہوتی رہیں جس سے ملت اسلامی کی اکثریت کے دل میں انکے خلاف نفرت ودشمنی پیدا ہوتا کہ ہمیشہ انکے ساتھ نبرد آزمائی کی صورتحال قائم رہے۔

وہ آرگنائزیشن اور کمیٹیاں جو اپنے لیٹرپیڈ پر ہیڈروں پر اور منشور میں لکھتے ہیں کہ ہماری سرپرستی قائم آل محمدؑ فرماتے ہیں 'ہمارا نصب العین تعلیمات آل محمدؐ کو فروغ دینا ہے 'انہوں نے کہیں بھی اسلامی ثقافت کا خیال نہیں رکھا بلکہ خود کو جدید اور زمانہ ساز دکھانے کیلئے مغربی ثقافت کے ہموار ہے۔

لہٰذا ان کے اجتماعات میں میری شرکت صرف جسمانی طور پر رہی فکری طور پر ہم شریک نہیں تھے۔ ان خیالات اور اپنی صحیح فکر کو مناسب موقع پر ہم اپنی تقریر و تحریر میں پیش کرتے رہے ہیں۔ اب ان ہی افکار وخیالات کو جمع کر کے "ہماری ثقافت اور ذمہ داریاں" کے نام سے یہ کتابچہ قارئین کرام کی خدمت میں نقد و نظر کیلئے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

میں اپنی تقریر و تحریر کے آخر میں ہمیشہ قارئین کرام سے اصلاح اور معاونت کی درخواست کرتا ہوں 'اسی درخواست کی پھر سے تکرار کر رہا ہوں۔ امید ہے وہ ہماری رہنمائی فرمائیں گے۔ والسلام

علی شرف الدین علی آبادی

رجب المرجب سنہ ۱۴۲۰ھ

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ثقافتی جہاد کا لائحہ عمل

ممکن ہے بعض افراد ہمارے اس موضوع کو ناپسند فرمائیں' اور کچھ کے نزدیک تو شاید یہ موضوع وقت کے زیاں کے زمرہ میں آئے کیونکہ آج کا دور مادی ترقی اور عمل پسندی کا دور ہے اور وہی قوم قوی اور غالب ہے جو مادی لحاظ سے طاقتور اور مسلح ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ ادارے جو اصول و ضوابط کی پاسداری کے لئے وجود میں آئے تھے وہاں بھی اسی کی بات بلند ہوتی ہے اور اسی کے قول کو مانا جاتا ہے جو مادی قوت و طاقت کا حامل ہو اور کمزور اقوام کا اصول و منطق کی حامل باتیں کرنا اور خالص علمی و معنوی مسائل پر بات چیت کرنا خاصا مشکل کام ہے۔

خود ہمیں بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کہ آج کا دور مادی ترقی اور ٹیکنالوجی کا دور ہے اور میدان اسی کے ہاتھ میں ہے جو ٹیکنالوجی کی دوڑ میں آگے ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ قوموں کے عروج و زوال میں ثقافت اور تمدن کو بھی بڑا دخل حاصل ہے اور اس کی حیثیت اگر اسلحے اور ٹیکنالوجی سے زیادہ نہیں تو ہم پلہ ضرور ہے۔

ثقافتی غلبہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے وسیع و عریض منصوبہ بندی اور

طویل مدتی عمل درکار ہوتا ہے جو عموماً پرجوش اور سوختہ دل افراد کے لئے ناگوار ہوتا ہے۔ قوموں کی تاریخ گواہ ہے کہ محکوم اقوام نے فوجی و عسکری طاقت اور ظلم وستم کے مقابل تو بڑی جراٗت دکھائی اور دشمن کے دانت کھٹے کردیئے لیکن دشمن کے ثقافتی اور تہذیبی حربوں کے آگے انہوں نے پسپائی اختیار کرلی اور اس کی ثقافتی یلغار کا مقابلہ نہ کرسکیں۔

آج کی مغربی دنیا نے تمدن وثقافت کی اہمیت کو بروقت جان لیا تھا اور پے درپے تجربات کے بعد انہیں اس حقیقت کا ادراک ہوچکا تھا کہ قوموں کو اسلحے اور فوجی طاقت کے زور پر اپنا اسیر رکھنا ایک مشکل کام ہے۔ لہٰذا انہوں نے ثقافتی یلغار کا آغاز کیا اور اپنی اس یلغار کے نتیجے میں وہ دنیا پر چھاگئے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم اپنے اصل موضوع کا آغاز کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے ثقافت کے لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کرتے ہیں۔

ثقافت کے لغوی معنی

۱ - لفظ ثقافت مادہ ثقفہ شی سے حاصل کیا گیا ہے جس کے معنی سرعت تعلیم اور سرعت فہم ہیں (لسان العرب)

۲ - ابن درید نے ثقفہ کے معنی خرد و عقلمندی بیان کئے ہیں۔ جیسے رجل ثقیف یعنی عقلمند مرد۔

۳ - قرآن کریم میں لفظ ثقفہ پانچ مقامات پر آیا ہے۔

ملعونین اینما ثقفوا اخذوا وقتلوا تقتیلا ○

(سورہ احزاب ۳۳۔ آیت ۶۱)

ضربت علیھم الذلۃ این ما ثقفوا ○

(سورہ آل عمران ۳۔ آیت ۱۱۲)

ان یثقفوکم یکونوا لکم اعداء ○

(سورہ ممتحنہ ۶۰۔ آیت ۲)

واقتلوھم حیث ثقفتموھم ○

(سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۱۹۱)

فخذوھم واقتلوھم حیث ثقفتموھم ○

(سورہ نساء ۴۔ آیت ۹۱)

تفسیر الفرقان کی جلد دوم صفحہ ۹۹ پر اس کے مصنف لفظ ثقفہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ غور و فکر کے ذریعہ کسی چیز پر مسلط ہونے کو ثقفہ کہتے ہیں۔

۴ - لفظ ثقافت موجودہ دور میں جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے اپنے اس وزن اور اس صیغہ میں قدیم کتب میں نظر نہیں آتا بلکہ اس لحاظ سے یہ لفظ تقریباً ایک نیا لفظ ہے۔

ثقافت کے اصطلاحی معنی

ثقافت معارف علمی کے اس مجموعہ کو کہتے ہیں جو بالواسطہ انسانی کردار اور افکار پر اثر انداز ہو۔

لہٰذا علمائے ثقافت جغرافیہ ' ریاضی ' فلکیات اور نجوم وغیرہ سے متعلق علوم کو ثقافت میں شامل نہیں کرتے 'کیونکہ یہ علوم انسانی کردار میں کوئی دخل نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک وہ شخص مثقف ہے جو مہذب اور بصیرت و آگاہی کا حامل ہو۔

اسلامی ثقافت

دین اسلام میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے لئے ایک خاص ثقافت ہے اور وہ اپنے ماننے والوں کو صرف اسی ثقافت کو اپنانے کی تاکید کرتا ہے۔

اسلامی ثقافت فکری اور عملی دونوں پہلوؤں پر محیط ہے اور اس کے ان دونوں پہلوؤں کا سرچشمہ ایک ماوراء مادہ وجود ازلی ہے۔

قرآن کریم عملی ثقافت کے حوالہ سے دو اصطلاحیں استعمال کرتا ہے:

۱ - شعائر

۲ - صبغہ

شعائر

شعائر شعیرہ کی جمع ہے 'مصباح المنیر میں ہے کہ شعائر جنگوں میں قوموں کی علامت کو کہتے ہیں۔ ایسی آواز کو بھی شعائر کہتے ہیں جو ایک دوسرے کی شناخت کے لئے یا متفرق گروہ کو جمع کرنے کے لئے لگائی جاتی ہے۔

علامہ طباطبائی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ شعائر ان علامات اور نشانیوں کو کہتے ہیں جنہیں خداوند عالم نے بندوں کی اطاعت اور فرمانبرداری کی علامت کے طور پر معین کیا ہے۔ ان شعائر میں نماز' روزہ' حج' زکوۃ' مسجد' اذان' نماز جماعت' نماز جمعہ' عرفات' صفا و مروہ' اور عتبات مقدسہ وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام شعائر بندگی اور اطاعت الہی کے علیحدہ علیحدہ مظاہر ہیں۔ البتہ یہ واضح رہے کہ یہ سب ایک ہی درجہ کی فضیلت کے حامل نہیں بلکہ ان کے مختلف درجات اور مراتب ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی بھی شعائر کو ترک کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ سورہ مائدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' خدا پرستی کی علامتوں کو پامال نہ کرو"

(سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۲)

ایک اور جگہ ارشاد ہے

"اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔"

(سورہ حج ۲۲۔ آیت ۳۱)

صبغہ

اسلامی ثقافت کے عملی پہلو کے سلسلے میں دوسرا لفظ جو قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے وہ صبغۃ اللہ یعنی الٰہی رنگ ہے۔

ارشاد رب العزت ہے:

"الٰہی رنگ اختیار کرو، اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہو گا؟۔"

(سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۱۳۸)

عام طور پر رنگ چیزوں کو ایک دوسرے سے امتیاز دینے اور علیحدہ پہچاننے کے کام آتا ہے اور مذکورہ بالا آیت مسلمانوں سے متقاضی ہے کہ وہ الٰہی رنگ اختیار کریں۔ یعنی اسلامی سماج میں الٰہی رنگ اتنا غالب ہو کہ اسے دوسرے معاشروں سے الگ پہچانا جاسکے۔

امت مسلمہ کی ثقافتی صورتحال

ثقافت و تمدن کے حوالہ سے مختلف اسلامی ممالک ان تین کیفیتوں میں تقسیم نظر آتے ہیں۔

(۱) مکمل طور پر مغربی ثقافت کے پنجے میں جکڑے جاچکے ہیں۔

(۲) غالب طور پر مغربی ثقافت کے ساتھ ساتھ اپنے آبا و اجداد کی قدیم ثقافت سے بھی چپٹے ہوئے ہیں اور اس میں ذرہ برابر رد و بدل کے روادار نہیں اور ایسی ہر کوشش کو آباؤاجداد سے خیانت قرار دیتے ہیں۔

(۳) مغربی ثقافت کے ساتھ ساتھ کسی حد تک اسلامی ثقافت بھی موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہاں لادین قوتیں مکمل طور پر اسلام کو ختم نہیں کرسکی ہیں۔

معمولی سے غور و تامل کے بعد اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موجودہ حالات میں

اسلام اور مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ باعث ضرر مغربی ثقافت ہے جو رفتہ رفتہ اسلامی معاشروں کی رگ وپے میں سرایت کررہی ہے۔ یہاں ہم اسلامی سماج کے ان شعبوں پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے جن میں مغربی ثقافت نے اپنے پنجے گاڑ دیئے ہیں۔

سیاست

انسانی سماج کی شہ رگ حیات اس کا سیاسی نظریہ ہے' اور کسی معاشرہ کا طرز سیاست ہی اس کے عروج وزوال پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔

قرآن کریم کی رو سے حق حاکیت صرف رب العالمین کو حاصل ہے اور انفرادی یا اجتماعی طور پر اس منصب کا کوئی دوسرا حقدار اور سزاوار نہیں' جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے:

"حکم صرف خدا ہی کے لئے ہے۔"

حکومت وقیادت کے لئے خداوند عالم نے اپنے نمائندے (انبیاء' ائمہ' صلحاء اور علماء) مقرر فرمائے ہیں جن کی خاص شرائط اور اوصاف کا بھی اپنی کتاب میں تذکرہ کردیا ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ امت اسلامی نے خداوند عالم کی ہدایات اور فرامین کو پس پشت ڈال کر مغربی طرز سیاست کو اپنایا ہوا ہے اور ایسی مغربی جمہوریت کو اپنے ممالک میں جگہ دے دی ہے جس میں حاکیت خداوند عالم کے بجائے عوام کے سپرد کردی گئی ہے۔

مختصر یہ کہ نظام سیاست میں سیکولرازم کو رائج کرکے خداوند عالم کے بھیجے ہوئے دین کو صرف مساجد تک محدود کردیا ہے۔

اقتصاد

ممالک اسلامیہ نے اپنے اقتصادی نظام کو یا تو مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام پر استوار کیا ہوا ہے یا مشرقی اشتراکیت پر۔

ہر دو صورتوں میں اقتصادی نظام سود پر استوار ہے، جس کی ہمارا مذہب سخت الفاظ میں مذمت کرتا ہے۔

زبان و ادب

اسلامی مصادر یعنی قرآن اور سنت عربی زبان پر مشتمل ہیں' ان مصادر سے مسلمانوں کو دور رکھنے اور اپنے منصوبہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مغرب نے دو راستے اختیار کئے۔ اہل عرب کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ انہیں عربی ادب اور فصیح و بلیغ قرآنی عربی سے ہٹا کر ان کے درمیان بازاری اور پھر مغربی کو فروغ دیا اور ایسا ماحول بنا دیا کہ وہ بازاری زبان فخریہ بولنے لگے۔

غیر عرب مسلمانوں کو عربی زبان و ادب سے دور کر دیا اور مختلف حیلوں بہانوں سے انہیں مغربی زبان و ادب کی تعلیم کی تشویق دی اور آج صورتحال یہ ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن کے پروردہ مسلمان عوام مغربی زبانوں کو سیکھنے کے لئے تو بے تابانہ سرگرداں نظر آتے ہیں لیکن علوم اسلامی اور اسلامی زبان و ادب کی تعلیم کی ان کے نزدیک کوئی حیثیت ہی نہیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ ہماری تمام توانائیاں صرف مغربی زبان و ادب سیکھنے میں ہی صرف ہو جاتی ہیں اور ٹیکنالوجی اور سائنسی علوم کہ جن کو حاصل کرنے کے لئے ہم ان زبانوں کی جانب راغب ہوئے تھے ان سے اب تک محروم ہیں۔

بعض ممالک جیسے ترکی اور انڈونیشیا وغیرہ میں تو مغربی زبان و ادب کی اسقدر ترویج کی گئی کہ ان ممالک کی زبانوں کے حروف تہجی تک بدل دیئے گئے اور ان زبانوں کو انگریزی حروف تہجی میں لکھا جانے لگا اور یوں ان ممالک کی جوان نسل قرآنی زبان کی ابجد سے بھی ناواقف ہو گئی۔

تعلیم و تربیت

ہمارے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم پر مغربیت کا غلبہ' کوئی ایسی چیز نہیں

جس کو ثابت کرنے کے لئے ہمیں زور قلم صرف کرنا پڑے۔ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ پورے عالم اسلام کا نظام تعلیم مغربی طرز تفکر پر مبنی ہے اور ظاہر ہے کہ اس نظام تعلیم و تربیت کی پروردہ نسل بھی مغرب سے مرعوب اور اسی کے طرز تفکر کی حامل ہو گئی ہے۔

آئین و قوانین

کسی بھی مملکت کا نظام سیاست اس کے آئین اور قوانین کا سرچشمہ ہوتا ہے اور جیسا کہ ہم نے نظام سیاست کے ذیل میں تذکرہ کیا تھا کہ ممالک اسلامیہ کا نظام سیاست مغربی یا مشرقی افکار پر مبنی ہے۔ اس بنا پر لامحالہ ان ممالک میں تدوین کئے جانے والے آئین و قوانین بھی مغربی نظریات پر مبنی ہوتے ہیں۔

ہاں اگر ممالک اسلامیہ کے آئین و قوانین میں باہم کچھ فرق نظر آتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ ان ممالک میں مغرب یا مشرق کا اثر و رسوخ مختلف درجات کا حامل ہے اور دوسرا سبب ان ممالک کی خاص معاشرتی اقدار ہیں ورنہ بنیادی طور پر ان آئین و قوانین کا سرچشمہ مغربی یا مشرقی نظریات ہی ہیں۔

رسوم و رواج

ممالک اسلامیہ میں اسلامی ثقافت کی ترویج نہ ہونے کی بنا پر، نیز اس ثقافت کے مقابل مغربی ثقافت کی یلغار کے سبب، مسلمانوں کے رسوم و رواج اور عادات و اطوار یا تو مغربی ثقافت پر مبنی ہیں یا پھر وہ اپنے آباء و اجداد کے چھوڑے ہوئے رسوم و رواج پر کاربند ہیں۔

مذہب اور مذہبی ثقافت سے ہماری دوری اور بے زاری کا یہ عالم ہے کہ مذہبی شعائر کی کوئی کتنی ہی بے حرمتی کیوں نہ کرے ہمارے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی لیکن اپنے آباء و اجداد کے رسوم و رواج جو نہ تو عقل و منطق کی کسوٹی پر

پورے اترتے ہیں اور نہ ہی دین و شریعت ان کی تائید کرتے ہیں، کی معمولی سی خلاف ورزی بھی ہمیں بے تاب کر دیتی ہے۔

اخلاقی فساد

مغربی طرز تفکر انسان کے صرف مادی پہلو سے بحث کرتا ہے اور معنویات کی اس کی نظر میں نہ کوئی حیثیت ہے اور نہ وقعت۔ مغربی ثقافت کے غلبہ نے اسلامی معاشروں سے معنوی تصورات کو محو کر دیا اور صرف مادی معیارات اور مادی تصورات باقی رہ گئے جس کا لازمی نتیجہ اخلاقی فساد اور تباہی کی صورت میں نمودار ہوا اور تمام اخلاقی اقدار کا جنازہ نکل گیا۔

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے سماج کے چیدہ چیدہ شعبوں کا تذکرہ کیا۔ لیکن اگر ذرا بھی غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہماری اجتماعی زندگی کا کوئی معمولی سے معمولی گوشہ بھی ایسا نہیں جو مغربی ثقافت کی دست برد سے محفوظ رہا ہو۔

ہمارے معاشروں میں وقتاً فوقتاً اٹھنے والی سیاسی تحریکیں کبھی وطنیت اور قومیت کے نام پر لوگوں کو ابھارتی ہیں اور کبھی طبقاتی منافرت اور حقوق و آزادی کے نام پر۔ یہ سب کی سب خلاف اسلام ہونے کی عکاس اور مغربی طرز فکر کی آئینہ دار ہیں۔

کسی قوم کی تقویم (کیلنڈر) کی ابتداء اسکی تاریخ کے کسی اہم موڑ سے ہوتی ہے۔ جیسے عیسائیوں کا کیلنڈر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلامی کیلنڈر کا حضرت محمد مصطفیٰؐ کی ہجرت سے آغاز ہوا۔ یوں یہ تقویم قوم کو اپنے ماضی سے منسلک رکھتی ہے۔ مغرب کی ثقافتی یلغار کے زیر اثر ممالک اسلامیہ سے ہجری تقویم تقریباً ختم ہو گئی ہے اور اسکی جگہ عیسائی تقویم نے لے لی ہے جس کے نتیجے میں آج مسلمان بچہ تقویم کے ذریعہ یہ تو بتا سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے لیکن یہ بتانے سے قاصر

ہوتا ہے کہ آج ہجرت کو کتنی صدیاں بیت چکی ہیں؟

ہمارے نظام تعلیم کے ساتھ ساتھ ہمارا نصاب تعلیم بھی مغربی اثرات سے خالی نہیں۔ پرائمری بلکہ اس سے بھی نیچے نرسری وغیرہ سے لے کر اعلیٰ درجات تک نصاب مغربی مفکرین کے نظریات کو بیان کرتا ہے' انہی کے مصنفین کا تیار کردہ ہے اور انہی کے نظریات کا پرچار کرتا ہے۔ مسلم مفکرین کے نظریات اور مذہبی اقدار و روایات اس نصاب میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مغربی ثقافت کے اثرات

سماج کے تمام ہی شعبوں میں مغربی اثرات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس بارے میں تفصیل بیان کی جائے تو اس کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ ہم یہاں فقط چند شعبوں کی نشاندہی پر ہی اکتفا کریں گے۔

سیاست میں مغربی انداز کو قبول کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم ہمیشہ کے لئے ان کے سیاسی تسلط کا شکار ہو گئے اور ہماری سیاست کی کنجی ان کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اب وہ ہر ممکن طریقہ کو بروئے کار لا کر ہماری سیاست پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یوں ہماری قیادتیں اور حکومتیں ان کے تابع فرمان اور اپنی بقاء و سلامتی کے لئے ان کی محتاج رہتی ہیں۔

اقتصادی نظام میں مغرب کی پیروی کے نتیجے میں مسلم سماج سود کی لعنت کا شکار ہوا اور ہم معاشی فوائد حاصل کرنے کے بجائے مغرب کے مقروض ہو گئے۔

اسلام کی اعلیٰ و ارفع اخلاقی اقدار تباہ و برباد ہو گئیں اور صرف مادیات پر بھروسہ کرنے اور اسی کو حقیقت جاننے اور ماننے کے نتیجے میں ہم اپنے عقائد و ایمان میں بھی کمزور ہو گئے۔

آج نہ ہماری کوئی نظریاتی اساس باقی رہی ہے اور نہ ہی قومی تشخص بلکہ ہماری حیثیت ایک غلام قوم کی سی ہو چکی ہے کہ جس کا اپنا کچھ بھی نہیں۔ بلکہ

اگر بظاہر اپنا کچھ ہے تو وہ بھی "آقا" کے اختیار میں ہے اور اس کا بھی مالک اور مختار کل وہی ہے۔

مغرب کے ہتھکنڈے

اپنی ثقافت کو اسلامی سماج میں رائج کرنے کے لئے مغربی اقوام نے وسیع منصوبوں پر عمل کیا اور مغربی ثقافت کی ترویج کے لئے بے شمار طریقے اختیار کئے۔ ان میں سے چند معروف طریقے یہ ہیں۔

(۱) مسیحی مبشروں کے ذریعہ تبلیغ۔

(۲) اپنے نظریات اور اپنی ثقافت پر مبنی علم کے فروغ کے لئے مدارس کا قیام۔

(۳) پسماندہ علاقوں میں طبی سہولتوں کی آڑ لے کر وہاں باقاعدہ تبلیغ۔

(۴) سماجی بہبود کی تنظیموں کے ذریعہ اپنی تہذیب اور ثقافت کا پرچار۔

(۵) تعلیمی وظائف کے ذریعہ ہمارے ممالک کے ذہین طلباء کو اپنے ممالک میں مدعو کرنا۔

مغربی ثقافت کے خلاف لائحہ عمل

مغربی ثقافت کی روک تھام اور اس کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کے طریقوں کے سلسلہ میں مسلمان مفکرین کے درمیان تین مختلف نظریات پائے جاتے ہیں:۔

ایک گروہ مغربی ثقافت سے نجات کا واحد راستہ مسند اقتدار تک رسائی کو قرار دیتا ہے' اس گروہ کے خیال میں کرسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد ہی اس ثقافت سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا یہ گروہ کرسی اقتدار تک رسائی کے لئے تمام جائز اور ناجائز ذرائع استعمال کرتا ہے اور اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے ہر ممکن طریقہ استعمال کرتا ہے۔ حکومت اور اقتدار کی

خاطر اپنائی جانے والی ان کی اس روش کی بنا پر بعض متدین اور شریف النفس مسلمان بھی دین و سیاست کے ملاپ کو ناجائز اور دین کے لئے ضرر رساں خیال کرنے لگتے ہیں اور وہ دینی عناصر کے سیاست میں حصہ لینے کے خلاف ہو جاتے ہیں۔

دوسرا گروہ مغربی ثقافت سے نجات کی واحد صورت صرف تعلیم و تربیت اور درس و تدریس کو قرار دیتا ہے۔ اس گروہ کے خیال میں رفتہ رفتہ دینی تعلیم و تربیت کے آثار معاشرے میں ظاہر ہوں گے اور پھر اسلامی ثقافت خود بخود مغربی ثقافت کی جگہ لے لے گی۔ اس موقع پر یہ حضرات اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ مغرب مسلسل اپنی ثقافت کی ترویج و تبلیغ میں مصروف ہے اور وہ اس کے لئے ہر طرح کے وسائل و ذرائع کو استعمال کر رہا ہے اور حد تو یہ ہے کہ خود مسلمانوں کے وسائل مغربی ثقافت کی ترویج میں صرف ہو رہے ہیں۔ گویا وہ خود ہمارے ہی خنجر سے ہمارا خون کر رہا ہے۔ نیز مغرب کے ذرائع و وسائل اتنے زیادہ اور قوی ہیں کہ ان کا مقابلہ ایک ایسی ہی قوی اور وافر وسائل کی حامل مشنری سے کیا جا سکتا ہے۔ بنا بر ایں صرف تعلیم و تربیت اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ مغرب کی ثقافتی یلغار کا مقابلہ اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ایک امر محال ہے۔

تیسرا گروہ ایک متوازن اور درست موقف کا حامل ہے اور عقل و منطق اور حقائق و واقعیت بھی اسی موقف کو قبول کرتے ہیں۔

اس گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی تمام توانائیاں کسی ایک میدان ہی میں صرف نہیں کر دینی چاہئیں یعنی اپنے کام کو صرف تعلیم و تربیت یا صرف سیاست کے میدان ہی تک محدود نہیں کر دینا چاہئے بلکہ بیک وقت اپنی صلاحیتیں تمام اجتماعی کاموں میں صرف کرنی چاہئیں اور ثقافت، سیاست اور تعلیم و تربیت کے امور کو پہلو بہ پہلو انجام دینا چاہئے تاکہ استعمار کا ہر محاذ پر

مقابلہ کیا جاسکے اور اس کے اثرات داخل ہونے کا ہر دروازہ بند کردیا جائے۔ چونکہ ثقافت کا انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبہ سے براہ راست اور گہرا تعلق ہے، اگر کسی ایک پہلو کو بھی نظر انداز کردیا جائے یا اسے ثانوی حیثیت دے دی جائے، تو لادینیت پر مبنی اثرات اس راستہ سے داخل ہو کر اپنا کام دکھا جائیں گے۔ ہماری اس بات کی یوں تو بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن اس کی سب سے سادہ اور واضح مثال معاشرے کے وہ افراد ہیں جو انفرادی طور پر تو دین و شریعت کی بے انتہا پابندی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور دینی واجبات میں کوتاہی اور تساہل کی بابت ان افراد کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا، لیکن ایسے افراد بھی اجتماعی اور سیاسی میدانوں میں لادین عناصر کا ساتھ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حضرت امام خمینیؒ اور ثقافتِ اسلامی

فکر امام خمینیؒ "سیمینار کے عنوان سے ہماری یہ چھوٹی سی کاوش حقیقتاً مادی اور معنوی سطح پر مختصر ہی ہے۔ حضرت امام خمینیؒ کی شخصیت اور افکار پر بحث کا حق مسلسل کئی بین الاقوامی سطح کے اجتماعات بھی ادا نہیں کر سکتے کیونکہ آپ کی زندگی، شخصیت اور افکار پر بحث بے شمار جہتوں سے کی جا سکتی ہے۔ علم، عرفان، اخلاق، حکمت، فلسفہ، فقاہت اور سیاست، غرض کوئی شعبہ زندگی ایسا نہیں جس پر حضرت امام خمینیؒ نے اثرات نہ چھوڑے ہوں۔

اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تاریخ انسانیت میں انبیاء اور ائمہؑ کے بعد امام خمینیؒ کا شمار ان فقید المثال شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے محکم بنیاد پر مشتمل افکار پیش کئے اور ان پر بھرپور انداز میں عمل کر کے دکھایا۔

ہم نے اپنے مقالہ کا موضوع "حضرت امام خمینیؒ اور ثقافت اسلامی" چنا ہے اور اس سلسلے میں ہم نے اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ حضرت امام کی فکر سے آگاہ ہوا جائے۔

ثقافت پر گفتگو شاید بیشتر افراد کے لئے کسی قسم کی دلچسپی کا باعث نہ ہو اور ممکن ہے کچھ افراد اس گفتگو کو پسند نہ فرمائیں۔ کیونکہ آج کا دور مادی ترقی اور

جدید ٹیکنالوجی کا دور ہے اور لوگ قوت و طاقت کی زبان کے عادی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ افہام و تفہیم کے لئے مذاکرات کی میز پر بھی اسی کی بات کو ترجیح دی جاتی ہے' اسی کا پلہ بھاری ہوتا ہے جو مادی طور پر زیادہ طاقتور اور ٹیکنالوجی کے میدان میں زیادہ آگے ہو۔ خاص کر کے ہماری نوجوان نسل جو ایک پر تشدد دور سے گزر رہی ہے اور جس کے سامنے مادی طاقت و قدرت کے مظاہر اور ان کے اثرات روزانہ کا معمول بن چکے ہیں' اس کی نظر میں اس قسم کی گفتگو ایک طرح حقیقی مسائل سے چشم پوشی اور ذمہ داری سے پہلو تہی کے مترادف ہے۔

خود ہمیں بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کہ دور حاضر میں میدان اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو قوت و طاقت کا مالک ہو' جو اجتماعی' سیاسی' اقتصادی اور عسکری طور پر مضبوط ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہم اس بات کے بھی شدت کے ساتھ قائل ہیں کہ ثقافت کی بھی اپنی ایک حیثیت ہے' ثقافت بھی اپنے سماجی اثرات رکھتی ہے' ثقافت اگر عسکری قوت سے بڑھ کر نہیں تو اس کی ہم پلہ ضرور ہے۔ حضرت امام خمینیؒ فرماتے ہیں:

"بے شک اولین اور اعلیٰ ترین عنصر جو ہر معاشرہ کے موجودات پر بنیادی اثر ڈالتا ہے اس معاشرے کی ثقافت ہے"۔

بنیادی طور پر ثقافت ہی ہے جو ہر معاشرے کی حقیقت اور اس کے وجود کو تشکیل دیتی ہے۔ ہر چند کہ معاشرہ اقتصادی' سیاسی' صنعتی اور فوجی شعبوں میں مضبوط ہو لیکن اگر اسکی ثقافت مضبوط بنیادوں پر نہ ہو تو کھوکھلا ہے۔ اگر معاشرے کی ثقافت مخالف کی ثقافت سے وابستہ یا اس سے خوراک لینے والی ہو تو لامحالہ اس معاشرے کے دیگر شعبہ مخالف کی جانب مائل ہوں گے اور آخر کار اسی میں جاملیں گے اور تمام شعبوں میں اپنے وجود کو گنوا بیٹھیں گے۔

ہر معاشرے کا وجود اور اس کا استقلال' اس کے ثقافتی استقلال سے نئی زندگی حاصل کرتا ہے اور یہ گمان کرنا سادہ لوحی ہے کہ ثقافتی وابستگی کے باوجود

دوسرے شعبوں میں یا کسی ایک شعبہ میں استقلال ممکن ہے۔

(۰۶/۶/۳۱)

ایک اور مقام پر امام فرماتے ہیں:

"ثقافت قوم کی تمام خوش بختیوں اور بد بختیوں کی بنیاد ہے۔ اگر ثقافت غیر صالح ہوگی تو وہ جوان جو اس غیر صالح ثقافت میں تربیت پائیں گے مستقبل میں فساد کا موجب ہوں گے۔ اگر ثقافت صحیح ہوگی تو ہمارے تمام جوان صحیح تیار ہوں گے۔"

(۵۶/۱۱/۱۹ نجف اشرف)

تاریخ قدیم سے دور حاضر تک چشم فلک نے بارہا یہ منظر دیکھا ہے کہ قوموں نے فوجی اور اقتصادی تسلط اور اقتدار سے تو جلد چھٹکارا حاصل کر لیا لیکن ثقافتی تسلط سے نجات حاصل نہ کر سکیں۔

ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ثقافت کے ذریعہ اپنے مقصد تک رسائی کے لئے وسیع منصوبہ بندی اور طویل عرصہ درکار ہوتا ہے اور اس کے نتائج کافی عرصہ بعد سامنے آتے ہیں جن کا انتظار اکثر پرجوش اور دل سوختہ افراد کے لئے گراں ہے۔ لیکن ثقافتی اثرات کی گہرائی اور سماج پر اس کے اثرات کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب ہم اپنے اصل موضوع پر آتے ہیں اور گفتگو کا آغاز ثقافت کے لغوی و اصطلاحی معنی سے کرتے ہیں۔

لغوی معنی

ثقافت مادہ "ثقفہ شی" سے ماخوذ ہے جس کے معنی سرعت تعلیم اور سرعت فہم ہیں۔ (لسان العرب)

ابن درید نے "ثقفہ" کے معنی خرد و عقلمندی کیئے ہیں۔ جیسے "رجل ثقیف" یعنی عقل مند مرد۔

صاحب تفسیر الفرقان اپنی تفسیر کی جلد دوم صفحہ ۹۹ پر لفظ ثقفہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "عقل و وقت کے ساتھ کسی چیز پر مسلط و محیط ہونے کو ثقفہ کہتے ہیں۔"

لفظ ثقافت اس وزن اور اس صیغہ میں کتب قدیم میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ یہ ایک نیا لفظ ہے تو غلط نہ ہوگا۔

فارسی زبان میں ثقافت کو فرہنگ اور انگریزی میں کلچر کہتے ہیں۔

ثقافت کا اصطلاحی مفہوم

ثقافت معارف علمی کے اس مجموعہ کو کہتے ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ انسانی سلوک و رفتار اور اس کے عقائد و اخلاق پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی بناء پر علمائے ثقافت علم جغرافیا، علم ریاضیات، علم فلکیات، علم نجوم اور علم ہندسہ وغیرہ کو علم ثقافت نہیں کہتے۔ کیونکہ یہ علوم انسانی سلوک و رفتار پر کوئی خاص اثر نہیں رکھتے۔

لہذا علماء ثقافت کی نظر میں مرد مثقف وہ نہیں جو زیادہ علوم پر دسترس رکھتا ہو، بلکہ اس کے لئے تزکیہ اور تہذیب اور بصیرت و آگاہی ایک لازمی ضرورت ہے۔

مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہر علم ثقافت نہیں سوائے اس علم کے کہ جو انسان کی رہنمائی و ہدایت کرتا ہو ---- اور ---- ہر عالم مثقف نہیں جب تک کہ اس نے خود علم کے ذریعے اپنے کو آراستہ و پیراستہ نہ کیا ہو۔ ایسا عالم خواہ کتنا ہی فاضل کیوں نہ ہو، تفسیر و حدیث و عقائد پر کتنی ہی دسترس کیوں نہ رکھتا ہو، اگر عالم باعمل نہیں تو درخت بے ثمر کی مانند ہے۔

بعض لوگ تمدن اور ثقافت کے مفہوم و معنی میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ثقافت کی جگہ تمدن و حضارت استعمال کرتے ہیں اور حضارت و تمدن کی جگہ ثقافت کو۔ جبکہ دونوں کا مفہوم و معنی اور محور مدعا بالکل مختلف ہے۔

تمدن لفظ مدینہ سے ماخوذ ہے اور انسانی زندگی کی مادی پیشرفت و ترقی کو تمدن وحضارت کہا جاتا ہے۔

جبکہ ثقافت سے مراد مفاہیم عقلی ' اخلاقی اور انسانی اقدار ہیں۔ ہاں ثقافت اور تمدن ایک دوسرے پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں۔ تمدن قوت تعقل و تفکر اور انسانی اخلاق کی ساخت میں اثر رکھتا ہے اسی طرح ثقافت تمدن پر اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن یہ ثابت کرنا کہ ان دونوں میں اصالت کا مالک کون ہے' آیا ثقافت اصل ہے یا تمدن کو اصلیت حاصل ہے ' اگر نا ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے کیونکہ اس کا جواب اس بات پر منحصر ہے کہ اصالت مادہ کو حاصل ہے یا تجرد و معنویت کو۔ جہاں تک فلاسفہ اسلام کا تعلق ہے تو وہ فرماتے ہیں کہ اصل ثقافت ہے کیونکہ اولیت مادہ کو نہیں معنویت و تجرد کو حاصل ہے۔

ایسا تمدن جو اسلامی ثقافت کا نتیجہ ہو اس کے خدوخال مختلف ہوں گے اور مادی ثقافت پر پروان چڑھنے والے تمدن کے خدوخال جدا۔

مندرجہ بالا گفتگو سے جو نکات سامنے آئے انھیں خلاصہ کے طور پر یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

ثقافت میں یہ چیزیں شامل ہیں:۔

۱۔ کسی چیز کو سرعت اور تیزی سے درک کرنا۔

۲۔ عقل و خرد کے ساتھ کسی چیز پر مسلط ہونا۔

۳۔ ثقافت انسانی زندگی کے مختلف شعبوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔

۴۔ ہر علم کو ثقافت نہیں کہا جاسکتا۔

۵۔ ہر شخص کو مثقف نہیں کہا جاسکتا۔

اسلامی ثقافت

دین اسلام انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں خواہ ان کا تعلق انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی زندگی سے ' خواہ سیاسی ہو یا اقتصادی ' تعلیمی ہو یا فنی ' خواہ

وہ امور دنیا سے متعلق ہوں یا آخرت سے تعلق رکھتے ہوں' اپنے ماننے والوں کو صرف اور صرف اپنی ایک خاص ثقافت اپنانے کا حکم دیتا ہے۔

حضرت امام خمینیؒ اس بارے میں فرماتے ہیں:

"کوئی یہ کہے کہ اسلام کا زندگی سے کیا سروکار تو یہ اسلام کے ساتھ جنگ کے مترادف ہے' یہ اسلام کی شناخت کا نہ ہونا ہے۔ یہ کہنا کہ اسلام کا سیاست سے کیا سروکار اسلام کے ساتھ جنگ کے مترادف ہے۔"

(۵۷/۷/۲۳)

اسلامی ثقافت علمی و فکری اور عملی دونوں شعبوں پر محیط ہے۔ جہاں تک فکری و علمی ثقافت کا تعلق ہے تو اسے قرآن کریم نے بصیرت' ہدیٰ اور نور سے تعبیر کیا ہے۔ جس کا سرچشمہ ایک مطلق اور ازلی وجود ہے۔

ثقافت عملی کے مظاہر کے لئے قرآن کریم دو الفاظ "شعائر" اور "صبغہ" کو استعمال کرتا ہے۔

شعائر

شعیرہ کی جمع ہے۔ یعنی علامت۔ جیسا کہ مصباح المنیر میں ہے کہ شعائر اس علامت کو کہتے ہیں جو دوران جنگ قوم کی نشانی کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ شعائر ان مخصوص صداؤں کو بھی کہا جاتا ہے جو لشکر کے افراد ایک دوسرے کی پہچان اور اپنے بچھڑے ہوئے اور متفرق ساتھیوں کو جمع کرنے کے لئے لگاتے ہیں۔

قرآن کریم نے مسلمانوں کے اطاعت قلبی کی پہچان کے لئے بھی کچھ علامات اور نشانیاں وضع کی ہیں' جو ان کے مومن' پاکباز اور باایمان ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔

علامہ طباطبائی تفسیر المیزان میں فرماتے ہیں:

"شعائر ان علامات اور نشانیوں کو کہا جاتا ہے جنہیں خداوند عالم نے بندوں کے لئے اپنی اطاعت و پرستش کے اظہار کے لئے وضع کیا ہے جیسے نماز، روزہ، حج، اذان، مسجد، عرفات، صفا و مروہ وغیرہ....."

بندگی اور اطاعت خدا کے مظاہر الگ الگ ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ ان تمام کی فضیلت مساوی و برابر نہیں بلکہ مختلف درجات و مراتب کی حامل ہیں۔ ایک بات جو ان میں مشترک ہے وہ یہ کہ ان میں سے کسی بھی شعار کو ترک کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ لہٰذا تمام چھوٹے بڑے اسلامی مظاہر اور تمام دینی شعائر کی پابندی ہی کو ثقافت اسلامی پر کاربند ہونے سے تعبیر کیا جائے گا۔ نیز انہیں شعائر اللہ کی پابندی کو قرآن کریم تقویٰ قلوب سے تعبیر کرتا ہے۔

صبغہ

قرآن کریم میں ثقافت عملی کے حوالے سے شعائر کے علاوہ دوسرا لفظ صبغہ استعمال ہوا ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ پورے معاشرہ پر الٰہی رنگ چھایا ہوا ہونا چاہئے اور ہر مسلمان کو اسی رنگ میں رنگا ہونا چاہئے۔ مرد مسلم کے انفرادی و اجتماعی، گھریلو و معاشرتی، معاشی و اقتصادی، سیاسی و تمدنی تمام امور پر رنگ خدا غالب ہو اور جس طرح ایک رنگ دوسرے سے بالکل الگ پہچانا جاتا ہے اسی طرح مسلمان انفرادی طور پر اور مسلم معاشرہ اجتماعی طور پر غیر مسلموں اور غیر مسلم معاشروں سے علیحدہ پہچانے جائیں۔

مسلم معاشرے میں رنگ و نسل، قوم و نژاد اور قبیلہ و عشیرہ سب پر صرف ایک ہی رنگ غالب ہو۔ "صبغۃ اللہ"۔ گویا اگر کسی معاشرے میں خواہ وہ مسلم افراد پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو، رنگ و نسل اور قوم قبیلہ کی بنیاد پر انسانوں کی تفریق ہو، اور انسان کی قدر و قیمت خدا کے بیان کردہ ملاک و معیار کے علاوہ کسی اور معیار و ملاک پر رکھی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں اسلامی ثقافت رائج نہیں۔

مغربی ثقافت

امام خمینیؒ فرماتے ہیں:

"اجنبی استعماری ثقافت کا روز افزوں رواج ام الامراض ہے جو کہ سالہاسال سے ہمارے جوانوں کی مسموم افکار پر پرورش کررہی ہے' اور استعمار کے داخلی ایجنٹ اس کو پروان چڑھارہے ہیں۔ ایک فاسد استعماری ثقافت استعمارزدہ گماشتوں کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس ثقافت کی خرابیوں کی تحقیق کی کوشش کیجئے اور اس سے ملت کو آگاہ کیجئے اور خدا سے دعا کیجئے کہ اس کو ناکام کرے۔ اس کی جگہ اسلام کی انسانی ثقافت کو جاگزین کیجئے تاکہ آئندہ نسلیں اس کی انسان ساز اور عدل پرور روش پر تربیت پائیں۔"

(۲۴/ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ ق)

مسلم معاشروں کے قریبا تمام ہی شعبوں میں مغربی ثقافت کی خراب کاریوں کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں ہم اس بارے میں صرف معمولی اشارات ہی پر اکتفا کریں گے۔

امام خمینیؒ فرماتے ہیں:

"بخدا اسلام پورا کا پورا سیاست ہے' اسلام کو غلط طریقہ سے پہچنوایا جاتا ہے۔ سیاست مدن اسلام سے سرچشمہ لیتی ہے۔"

(۲۱/۱/۴۳ھ۔ق)

(۱) اسلامی نظام سیاست میں بنیادی حیثیت حاکمیت الٰہی کو حاصل ہے اور بندگان خدا پر حکومت وقیادت کا حق صرف خدا کے فرستادہ اور برگزیدہ افراد ہی کو حاصل ہے اور ان کی غیرموجودگی میں یہ حق ان افراد کو حاصل ہے جو خداوند عالم کی جانب سے عائد کردہ شرائط کے حامل ہوں لیکن صد افسوس کہ مغرب نے مسلم معاشروں میں ایسی سیاست کو فروغ دیا جس کے نتیجے میں یا تو ان کے

آمر ایجنٹوں کا اقتدار قائم ہے یا کہیں کہیں مغربی جمہوریت کے ذریعہ حکمرانوں کا چناؤ ہوتا ہے۔ اس انتخاب کے موقع پر خداوند عالم کی جانب سے عائد کردہ شرائط اور پابندیوں کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا اور الٰہی تعلیمات کو یکسر پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے اس طرز عمل کی بنا پر اسلامی ثقافت میدان سیاست سے خارج ہو گئی ہے۔

(۲) اسلام کے عادلانہ اقتصادی نظام کو پس پشت ڈال کر اکثر اسلامی ممالک مغرب کے سرمایہ دارانہ یا مشرق کے کمیونسٹ نظام اقتصاد کو اپنائے ہوئے ہیں۔

(۳) اکثر اسلامی ممالک میں مغربی نظام تعلیم رائج ہے اور اس نظام تعلیم کے پروردہ نہ تو اچھے انسان بن پاتے ہیں اور نہ ہی ایک عمدہ مسلمان۔

(۴) مسلمانوں کا دستور اور آئین و شریعت قرآن کریم ہے جو الٰہی دستور حیات ہے لیکن عملی طور پر آج اکثر ممالک اسلامیہ مغرب کے ساختہ و پرداختہ دساتیر و قوانین اپنائے ہوئے ہیں۔

(۵) مسلم معاشروں میں روز مرہ عادات و رسوم، ایک دوسرے سے سلوک و رفتار، باہمی تعلقات و روابط اور لباس و طرز زندگی میں ہمیں کلی طور پر مغربی عادات و رسوم کی چھاپ نظر آتی ہے اور خال خال ہی اسلامی و دینی عنصر دکھائی دیتا ہے۔

(۶) ممالک اسلامیہ میں مغربی انداز سیاست سرائت کر جانے کی بنا پر قیادت و سیادت کے تمام اسلامی معیار و ملاک متروک ہو گئے، ہر فرد جائز و ناجائز طریقے سے مسند اقتدار پر قبضہ جمانے کی فکر کرنے لگا اور وحدت امت پارہ پارہ ہو گئی کیونکہ کوئی قبیلہ و عشیرہ کی بنیاد پر، کوئی رنگ و نسل کی بنیاد پر اور کوئی طبقاتی تقسیم کی بنیاد پر حکومت کے حصول پر کمربستہ ہوا۔

یہاں ہم نے ممالک اسلامیہ اور اسلامی معاشروں کے مختلف شعبوں میں مغربی ثقافت کے در آنے کا تذکرہ کیا۔ یاد رہے کہ یہ فقط چند موارد تھے جن کی

جانب تنگی وقت کی بناء پر ہم نے اشارہ کیا۔ لیکن اگر امت اسلامی کی حالت پر سرسری نگاہ ڈالی جائے تو بآسانی معلوم ہو گا کہ امت کی زندگی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جو مغربی ثقافت اور اس کے اثرات سے پاک ہو۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ امت اسلامی کے تقریباً تمام ہی امور میں مغربی ثقافت کا رنگ غالب ہے۔

مسلمانوں کے مغربی ثقافت کو قبول کر لینے 'اس ثقافت کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے اور اس کا تسلط قبول کر لینے کی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ مغرب کی مادی ترقی کی چکاچوند ہے جس کی بناء پر مسلمان مغربی ثقافت کے چنگل میں گرفتار ہوئے۔ یہاں ایک بات پیش نظر رہے کہ ہم علوم و فنون اور ٹیکنالوجی و سائنس میں ترقی کے مخالف ہرگز نہیں اور نہ ہی ان چیزوں کے مغرب سے حاصل کرنے پر ہمیں کوئی اعتراض ہے' ہم جس بات کے مخالف ہیں وہ مغرب کی ثقافت کے تسلط کو قبول کر لینا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ہم نے مغربی علوم فنون اور ٹیکنالوجی سیکھنے اور اس پر عبور حاصل کر کے ان کے مثبت نتائج سے اپنے سماج کو متمتع کرنے کی خاطر پہلا قدم یہ اٹھایا کہ مغرب کی زبان و ادب پر عبور حاصل کیا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا "پہلا قدم" تو اگر یہ پہلا قدم ہی ہوتا اور اس کے بعد ہم مسلسل پیش قدمی کرتے رہتے اور اپنی ثقافت و اقدار پر کاربند رہتے ہوئے مغرب کی ٹیکنالوجی سے استفادہ کرتے تو اس میں کوئی کلام ہی نہ تھا۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ ہماری اغلب توانائیاں روز اول سے آج تک انگریزی زبان و ادب کے حصول میں ہی صرف ہوئیں اور مغربی ٹیکنالوجی اور علوم فنون سے خاطر خواہ استفادہ نہ کر سکے بلکہ اسکے نتیجہ میں ہم مغربی ثقافت اور اس کے مفسدات کے قعر ذلت میں جا گرے۔

ہماری اس گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ نہ کر لیا جائے کہ ہم مغربی علوم فنون اور

زبان و ادب سیکھنے کے مخالف ہیں۔ بلکہ ہمارا نظریہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ جب ہم زبان سیکھیں تو ہمارے سامنے دو اہداف ہوں ایک یہ کہ اسلام کی ارفع تعلیمات کو غیر مسلموں تک پہنچانا اور دوسرا دیگر زبانوں میں پائے جانیوالے علوم وفنون سے آشنائی۔

لیکن افسوس کہ ہم اس معاملے میں سراسر نقصان کا شکار ہوئے اور وہ اس طرح کہ ایک طرف تو ہم اپنے اقدار و اوصاف سے محروم ہوگئے اور مغرب کی مادی ثقافت کے اسیر بن گئے اور دوسری طرف جس مقصد کے حصول کی خاطر ہم نے یہ قدم اٹھایا تھا اس میں بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کرسکے۔ نیز مزید ایک ظلم ہم پر یہ ہوا کہ ہم مغرب سے مکمل طور پر وابستہ ہوگئے اور ہماری آزادی اور ہمارا استقلال جاتا رہا۔

ہمارا نظام تعلیم مغرب کے مادی رجحانات پر استوار ہے۔ اس طرز تعلیم کی پروردہ نسل لامحالہ مادی افکار و خیالات کے قالب میں ڈھل گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوم کے ہاتھوں سے دینی عقائد اور اسلامی اخلاق جاتے رہے۔ آج ہمارے معاشرے کی اخلاقی تنزلی اور بے راہ روی، اسی مغربی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ حضرت امام خمینیؒ فرماتے ہیں:

> "مادی اور حیوانی زندگی کی قدر و قیمت کے قائل نہ ہوئیے۔ قرآن نے ایسے انسان کی تعمیر کی جو خدائی طاقت کے بل بوتے پر آگے بڑھا اور نصف صدی سے بھی کم عرصہ میں بادشاہتوں پر غلبہ حاصل کیا۔ اب قوموں کو چاہئے کہ وہ پیرو قرآن ہو جائیں، چاہئے کہ قرآنی انسان ایجاد کریں تاکہ قومیں ترقی کرسکیں۔"

(۵۸/۱۹ھ۔ش)

اسلامی ثقافت کا احیاء

اب تک ہم نے اپنی گفتگو میں ثقافت کے لغوی و اصطلاحی معنی و مفہوم اور

مغربی ثقافت کے نقصانات ومفسدات پر روشنی ڈالی۔ اب ہم معاشرے میں اسلامی ثقافت کے احیاء کے سلسلے میں اہل فکر و دانش کے افکار و خیالات پر روشنی ڈالیں گے۔

بے شمار دیگر مسائل کی مانند ارباب فکر و نظر اس سلسلہ میں بھی مختلف آراء و افکار کے حامل ہیں:

پہلا گروہ

اس گروہ سے تعلق رکھنے والوں کا خیال ہے کہ سردست مسلم معاشروں میں اسلامی ثقافت کے احیاء و ترویج کیلئے کوشش کرنا وقت ضائع کرنے اور دشمن کو فرصت فراہم کرنے کے مترادف ہے۔ ثقافت کے احیاء و رواج سے پہلے ہمیں سیاسی جدوجہد کے ذریعہ اغیار کے تسلط سے نجات حاصل کرنا چاہئے اور قوت وطاقت اور اقتدار کے حصول کے بعد معاشرہ میں اسلامی ثقافت رائج کرنا ایک سہل و آسان کام ہے۔ اس بناء پر ہمیں اس وقت سیاسی کارکن اور مجاہد افراد تیار کرنے چاہئیں۔

دوسرا گروہ

اس گروہ کا نظریہ ہے کہ ہمیں اپنی تمام صلاحیتیں ثقافت کی ترویج پر صرف کرنا چاہئے۔ جب لوگ آگاہ اور بیدار ہوں گے تو خود بخود سیاسی تبدیلی وجود میں آجائے گی۔

گروہ اول اور گروہ دوم دونوں افراط و تفریط کا شکار ہیں۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں حضرت امام خمینیؒ کی کیا رائے ہے۔ اور یاد رہے کہ یہ کلمات جدوجہد انقلاب کے دوران کے ہیں۔

"ایک مملکت کی اصلاح کا ذریعہ اس کی ثقافت ہے۔ اصلاح کو ثقافت سے شروع ہونا چاہئے۔ استعمار ہماری ثقافت پر بڑا کام کر رہا ہے۔ وہ

نہیں چاہتا کہ ہمارے نوجوانوں کا مستقبل تابناک ہو اور نہیں چاہتا کہ یونیورسٹیوں میں ہمارے جوان آگے بڑھیں۔ اگر ثقافت درست ہو گی تو گویا ایک مملکت کی اصلاح ہو گی۔ کیونکہ ثقافت ہی سے لوگ وزارت خانوں کو جاتے ہیں، ثقافت ہی سے اسمبلی میں پہنچتے ہیں، ثقافت سے حکومت کے کارکن بنتے ہیں۔ تم ایک آزاد ثقافت تشکیل دو یا ہمیں دیدو کہ ہم تشکیل دیں۔ تم امریکہ سے ڈرتے ہو، دوسروں سے ڈرتے ہو، ہمیں دو، ہم ثقافت تشکیل دیں۔ ثقافت کی تشکیل کے اختیارات ہمیں دیدو۔"

(۴۲/۶/۲۷)

یقیناً صحیح راہ یہی ہے کہ ہمیں ثقافتی تبدیلی کے لئے بھی پیش رفت کرنا چاہئے اور لوگوں کو دین شناس اور بیدار بھی بنانا چاہئے اور ساتھ ساتھ سیاسی اور مجاہد افراد بھی تیار کرنے چاہئیں اور سیاسی تبدیلی کے لئے جدوجہد بھی کرنی چاہئے۔

ہم اسی نقطہ نظر کے حامی ہیں کیونکہ پہلے دونوں نقطہ ہائے نظر میں خامی اور کمی پائی جاتی ہے۔

کیونکہ اگر ہم پہلے مرحلہ میں صرف حکومت کی تبدیلی اور اقتدار کے حصول کی کوشش کریں تو اقتدار حاصل کر لینے کے بعد ہمارے پاس اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ مقتدر ہو جانے والا ٹولہ جو اسلامی ثقافت اور اسلام سے عاری ہے اسلام اور آئین اسلام پر عمل پیرا ہو گا اور اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق معاشرے کی قسمت کے فیصلے نہیں کرے گا۔

اسی طرح دوسرا نظریہ بھی درست نہیں کیونکہ اگر تعلیم و تربیت کے حوالے سے غور کیا جائے تو کتنے افراد ہیں جو اس جانب متوجہ ہوں گے جبکہ ہمارے ملک میں خواندگی کی شرح نہایت کم ہے اور پھر جو لوگ خواندہ ہیں ان

میں دینی رجحان کس قدر ہے۔ اس بنا پر یہ کوشش بھی عمر نوحؑ کی طالب اور سعی لاحاصل ہوگی۔ اس طرح اگر ہم کچھ لوگوں کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو یہ تعداد اتنی قلیل ہوگی کہ اس سے معاشرے میں کسی تبدیلی کی امید عبث ہے۔

امام خمینیؒ فرماتے ہیں کہ:

"آپ کو چاہئے کہ صنعت، ثقافت اور تمام ان امور میں جن کی ایک مملکت کو ضرورت ہے غیر متعہد اور غیر وابستہ ہو جائیں۔"

(۶۱/۱۲/۲۳ھ۔ش)

غرض کہ کلام فیصل یہی ہے کہ ہمیں اسلامی معاشرے میں تبدیلی لانے کے لئے سماج کے ہر میدان اور ہر شعبہ کو یکساں اہمیت دینا ہوگی۔ اور

امام خمینیؒ کے اس قول کے مطابق جدوجہد کا آغاز کرنا ہوگا کہ:

"اسلامی ثقافت پر بھروسہ کیجئے اور مغرب اور مغرب زدگی سے جنگ کیجئے۔ خود اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے اور مغرب و مشرق زدہ روشن فکروں پر حملہ کیجئے اور اپنی حقیقت کو پالیجئے۔"

(۵۹/۶/۲۱ھ۔ش)

اسلامی ریاست کے مقاصد واہداف

شرکاء محترم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس باوقار اور مقدس سیرت کانفرنس میں ملک کے مایہ ناز جید علماء ودانشور حضرات کے حضور مقالہ پیش کرنے کے لئے ہم نے "اسلامی ریاست کے مقاصد واہداف" کے عنوان کا انتخاب کیا ہے۔ اس موضوع کی وضاحت اور اسمیں بیان کئے جانے والے مطالب سے کما حقہ آگاہی کے لئے اس کے تینوں اجزاء یعنی "اسلام" "ریاست اور مقاصد کی وضاحت ضروری ہے۔

اس موضوع کا پہلا کلمہ "اسلام" ہے۔ کتب لغات کے مطابق لفظ "اسلام" مادہ سلم سے ماخوذ ہے۔ اہل لغت اس کے تین معنی ذکر کرتے ہیں۔

(۱) اخلاص، ظاہری اور باطنی برائیوں سے سالم ہونا۔

(۲) صلح وامن۔

(۳) اطاعت وانقیاد۔

لیکن شرعی اصطلاح میں اسلام اس دین کو کہا جاتا ہے جس کی دعوت خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیؐ نے انسانیت کے سامنے پیش کی۔ اگرچہ آیات قرآنی

کے مطابق حضرت آدم صفی اللہ سے حضرت محمد حبیب اللہؐ تک تمام انبیاء کی دعوت دین اسلام ہی کے لئے تھی لیکن اسلام ایک مکمل اور عالمی دین کی صورت میں چونکہ حضرت محمد مصطفیٰؐ کے ذریعہ انسانیت کو عطا ہوا' اس لئے آنحضرتؐ کو پیغمبر اسلام اور اسلام کو آنحضرتؐ کا لایا ہوا دین کہا جانے لگا۔

آیات قرآنی اور روایات کی روشنی میں دین اسلام یا شریعت خاتم الانبیاءؐ کا جائزہ لینے سے اس دین کی مندرجہ ذیل خصوصیات اور امتیازات سامنے آتی ہیں۔

قرآن کریم جو اس دین کا دستور العمل ہے اسکے بارے میں ارشاد الٰہی ہے:

"ما فرطنا فی الکتاب من شئ"

"ہم نے اس کتاب میں کوئی کسر نہیں چھوڑی (سورہ انعام ۶۔ آیت ۳۸)

یا ایک اور مقام پر ہے کہ "کوئی خشک و تر ایسا نہیں جس کا ذکر قرآن میں نہ ہو۔" (سورہ انعام۔ ۳ آیت ۵۹)

پیغمبر اسلامؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا:

"میں نے تمہیں ہر اس چیز کا حکم دیا ہے جو تمہیں جنت سے نزدیک اور جہنم سے دور کرنے والی ہے اور ہر اس چیز سے روکا ہے جو تمہیں جہنم سے نزدیک اور جنت سے دور کرنے والی ہے۔"

بکثرت آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ سے واضح و روشن ہے کہ اسلام ایک کامل و اکمل دین ہے' جس میں انسان کی خیر و سعادت کا موجب ہونے والی ہر شے کا ذکر موجود ہے اور ہر اس چیز کے بارے میں انتباہ کر دیا گیا ہے جو انسان کی شقاوت اور بدبختی کا سبب ہو سکتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام ایک مکمل دین ہے جس میں کسی قسم کا نقص' عیب یا کمی نہیں پائی جاتی۔

مقالے کے موضوع کا دوسرا لفظ "ریاست" ہے۔ "ریاست" عربی لفظ رئیس سے ماخوذ ہے۔ انگریزی میں اسے STATE کہا جاتا ہے۔ "رئیس" حاکم، حکمراں یا سربراہ کو کہتے ہیں اور اسی رعایت سے ریاست کا لفظ حکومت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کے مترادف الفاظ میں امارت، خلافت، ولایت، امامت اور سلطنت وغیرہ شامل ہیں۔ یہ مترادف الفاظ اپنے خاص امتیازات کی بناء پر ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ معنوں میں مستعمل ہیں لیکن سب کے مشترک معنی "حکومت" ہے۔

علمائے سیاست کہتے ہیں کہ "ریاست" تین عناصر سے مرکب ہے۔

۱۔ انسان یعنی انسانی سماج۔

۲۔ خطہ ارض۔ یعنی جغرافیائی حدود۔

۳۔ حکمران۔ یعنی نظام حکومت چلانے والا حاکم و فرمانروا۔

ان تینوں عناصر کا مجموعہ "ریاست" کہلاتا ہے۔

انسانی معاشرے میں ریاست و حکومت کب وجود میں آئی، اس سلسلے میں مفکرین اور دانشوروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ محض ایک اجتماعی قرارداد ہے جبکہ بعض نے اسے سرمایہ داروں کی پیداوار قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک دن آئے گا جب تمام حکومتیں تحلیل ہو جائیں گی لہٰذا اس سے بے نیازی ممکن ہے۔

اسلام سماج کیلئے حکومت کو لازم و ضروری قرار دیتا ہے۔ یہ ضرورت از خود سماج کے اندر سے نمودار ہوتی ہے۔ اسے ایک فطری ضرورت کہا جا سکتا ہے۔ یعنی جس طرح حیات انسانی کی بقاء کے لئے پانی ضروری ہے اسی طرح انسانی سماج بغیر حکومت کے نہیں رہ سکتا۔

انسانی سماج کے پہلے مرحلے میں اسکی فطرت سادہ تھی، اسکی صلاحیت و قابلیت محدود تھی۔ جوں جوں انسان کی صلاحیتوں اور قابلیتوں میں اضافہ ہوا،

حالات مختلف ہوگئے' اسکی ضرورتیں بڑھ گئیں اور اس کے نتیجے میں انسانوں کے درمیان باہمی اختلافات ظاہر ہونے لگے۔ ان اختلافات کو دور کرنے' معاشرے کو تنازعات سے محفوظ رکھنے اور لوگوں کی صلاحیتوں کی نشونما کے مواقع فراہم کرنے کی غرض سے قانون وضوابط کے عملی نفاذ کے لئے حکومت کی ضرورت پیش آئی۔

خداوند سبحانہ تعالی نے انسان کی مذکورہ ضرورت کی تسکین کے لئے "دین" کے عنوان سے ایک نظام حیات عطا فرمایا اور اس کے اجرا ونفاذ کے لئے انبیاء و اوصیاء مبعوث فرمائے تاکہ ایک طرف تو انسانی صلاحیتیں رشد وارتقاء پائیں اور دوسری طرف لوگوں کے مابین پائے جانے والے اختلافات اور تجاوز وتعدی کو کنٹرول کیا جاسکے اور اسے حدود میں رکھا جاسکے۔ پس انسانی سماج نہ تو کبھی حکومت سے بے نیاز رہا ہے اور نہ کبھی بے نیاز رہ سکتا ہے۔ اسی ضرورت کو نہایت صراحت کے ساتھ امیرالمومنینؑ نے اس وقت بیان کیا جب خوارج نے حکومت وقیادت کی ضرورت کو مسترد کیا۔ حضرت علیؑ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ:

> "ایک معاشرے کے لئے حکمراں لازم ہے' خواہ وہ سماج دینی واسلامی ہو یا لادینی اور غیر اسلامی۔ کوئی معاشرہ حکومت سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔"

انسانی تاریخ میں معاشرے کے لئے حکومت کی ضرورت کے بارے میں کبھی اختلافات نہیں رہا' سب ہی اس کے معترف رہے ہیں۔

قرآن کریم قیام حکومت کو فلسفہ دین اور فلسفہ بعثت انبیاءؑ قرار دیتا ہے۔ متعدد انبیاءؑ نے حکومتیں قائم کیں' خود حضرت محمد مصطفیؐ نے سب سے پہلی اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ بہت سے انبیاءؑ نے اس سلسلے میں کوششیں کیں۔

پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد بھی بہر صورت اسلامی حکومت موجود رہی۔ یہاں تک کہ چودہویں صدی کے آغاز میں فرنگیوں نے حکومت اسلامی کو مکمل طور پر نیست ونابود کر دیا اور مسلمان ممالک میں نیشنلزم اور سیکولرازم پر مبنی حکومتیں قائم کیں۔

اپنے قبضہ و غلبہ کو دوام دینے کی خاطر استعمار نے خود مسلمانوں کی صفوں میں موجود اپنے زر خرید دانشوروں اور سیاستدانوں کے ذریعہ اسلامی اقدار و مفاہیم کو مجروح کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں انہیں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ لیکن پاکباز و صالح فرزندان اسلام اور ذمہ دار علمائے مکتب اسلام نے ان تصورات کو بالکل ہی محو ہونے سے بچائے رکھا' انہی مفاہیم میں حکومت اسلامی کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اسی جہاد کی بنا پر آج کے بدترین حالات میں بھی حکومت اسلامی کے قیام کے دم ساز موجود ہیں اور یہ فکر روز بروز پروان چڑھ رہی ہے۔

اسلامی ریاست کی شکل وصورت

اسلامی ریاست کے قیام کے بارے میں دو پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک کا تعلق استعماری حربوں سے ہے۔ استعماری قوتیں اپنی تمام قوت و توانائی کے ساتھ اسلامی حکومت کے قیام کی راہ میں مزاحم ہیں۔ اور دنیا کے کسی بھی خطہ میں' چھوٹی سے چھوٹی اسلامی ریاست کا قیام بھی انہیں گوارا نہیں۔ ان قوتوں کا شدید دباؤ مسلمانوں کو اسلامی حکومت کے قیام سے مایوس کئے ہوئے ہے اور وہ اسلامی حکومت کے قیام کو خواب و خیال سمجھنے لگے ہیں۔

دوسری پیچیدگی کا تعلق مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کے نتیجے میں اسلامی حکومت کے بارے میں ہر فرقے کی علیحدہ علیحدہ سوچ سے ہے۔ اس اختلاف نے مسلمانوں کو مشوش و مضمحل کیا ہوا ہے کہ ایسے ملک میں جہاں مختلف اسلامی

فرقوں سے تعلق رکھنے والوں کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے اور کوئی فرقہ غالب اکثریت میں نہیں وہاں اسلامی حکومت کی کیا شکل و صورت ہوگی کیونکہ اسلامی حکومت کی کوئی شکل بظاہر ایسی نظر نہیں آتی جس پر تمام فرقے متفق ہوں۔

یہ دونوں پیچیدگیاں قابل حل ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارا موقف ان دو نکات پر مشتمل ہے۔

الف: جیسا کہ متعدد دلائل و براہین سے ثابت ہے کہ اسلام میں حکومت کا تصور کوئی نئی دریافت نہیں بلکہ اسلام اور ریاست ہمیشہ سے ساتھ ساتھ ہیں اور اسلامی احکام کا نفاذ حکومت کا متقاضی ہے۔ حکومت کے قیام کا فریضہ دیگر فرائض دینی سے کئی گنا اہم ہے اور اوجب الواجبات میں سے ہے۔ اسے ترک نہیں کیا جا سکتا' جس طرح نماز کو کسی صورت نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اگر موانع و مشکلات حائل ہوں تو انہیں دیکھ کر گھٹنے ٹیک دینا درست طرز عمل نہیں بلکہ اس صورت میں ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے۔ بہر صورت یہ فریضہ کسی صورت ساقط نہیں ہوتا۔

ب: اسلامی حکومت کی شکل و صورت کے بارے میں اختلاف آج پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے فوراً بعد ہی پید ہو گیا تھا اور حاکم اسلامی کے تعین کے بارے میں اختلاف رائے اسی وقت سے موجود ہے۔ گزشت زمان نے اس اختلاف کو کم نہیں کیا بلکہ یہ زیادہ سے زیادہ ہی ہوتا چلا گیا' جس کا ثبوت تاریخ اسلام کے صفحات ہیں۔ لیکن شیعہ ائمہؑ اور علماء نے اس اختلاف کو بنیاد بنا کر حکومت اسلامی کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری سے دستبردار ہو کر گوشہ نشین ہونا گوارہ نہ کیا۔ لہٰذا آج بھی اختلاف کو بہانا بنا کر اس سلسلے میں جدوجہد سے فرار کا کوئی جواز نہیں۔

رسول مقبولؐ کی وفات کے بعد تشکیل پانے والی حکومت سے حضرت علیؑ کا اختلاف ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے۔ آپؑ کا موقف تھا کہ خلیفہ المسلمین

کا انتخاب امت کا حق نہیں بلکہ اسے منصوص من اللہ و رسولؐ ہونا چاہیے۔ لیکن اسکے باوجود حکومت اسلامی کو لاحق خطرات کے مواقع پر آپؑ نے خلفاء کو اپنے مفید مشوروں سے نوازا اور وقتاً فوقتاً ان کی مدد کی۔ یہی نہیں بلکہ مصالح اسلامی کی حفاظت کے لئے آپؑ کے بہت سے اصحاب نے ان حکومتوں میں مناصب قبول کئے۔ اس سب کے باوجود حضرت علیؑ نے کبھی اپنے حق کے اظہار میں کوتاہی نہیں کی اور اپنے مسلمہ حق سے دستبردار نہیں ہوئے۔

اسلامی ریاست کے مقاصد

اسلامی ریاست اور لادین حکومتوں کے مقاصد میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لادین حکمرانوں کا مقصد سیاہ و سفید کا مالک ہو کر اپنے دنیوی مفادات کا حصول ہوتا ہے۔ ملک و ملت کی فلاح ان کے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور ان کے فلاحی اقدامات کا مقصد اپنے اقتدار کا دوام ہوتا ہے۔ انہیں نہ خوف خدا ہوتا ہے نہ خوف سزا اور نہ ہی وہ کسی غیبی ہاتھ سے ہراساں ہوتے ہیں۔ ہاں وہ محض قوم کو اپنے اقتدار کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں' لہٰذا کبھی انہیں خوش کر کے اور کبھی ڈرا دھمکا کر خاموش کر کے اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ الغرض ان کا مطمع نظر اپنے اقتدار کی بقا ہوتا ہے۔ جبکہ اسلامی ریاست کا مقصد سماج میں عدل و انصاف کا قیام' لوگوں کے لئے دنیا و آخرت کی سعادت کے دروازے کھولنا اور ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشنا ہوتا ہے۔ لہٰذا اسلامی حکمران ان معین اہداف کے لئے جدوجہد اپنا نصب العین سمجھتا ہے' وہ لوگوں پر رعب گانٹھنے' اپنے مفادات کے حصول اور دنیاوی جاہ کے لئے حکومت کے حصول کی تمنا نہیں کرتا۔ حضرت علیؑ سے مختلف مواقع پر صادر ہونے والے مندرجہ ذیل اقوال اسلامی حکمراں کی نفسیات کے عکاس ہیں۔

"تمہاری حکومت میری نظر میں (اس پھٹے ہوئے) جوتے سے بھی کم قیمت ہے۔"

"میری نظر میں پوری دنیا کی حکمرانی بکری کی چھینک سے نکلنے والے لعاب سے بھی زیادہ حقیر ہے۔"

"میں حکومت کو جذام میں مبتلا خنزیر کے گوشت کی طرح سمجھتا ہوں۔"

"ہم حکومت اسلئے چاہتے ہیں تاکہ حق کی حکمرانی ہو' باطل سرنگون و نابود ہو۔"

"بار الہا تو خوب جانتا ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہم سے جنگ و پیکار کی صورت میں ظاہر ہوا' اسلئے نہ تھا کہ ہمیں تسلط و اقتدار کی خواہش تھی' یا مال و دنیا کی طلب تھی' بلکہ یہ اس لئے تھا کہ ہم دین کے نشانات کو (پھر ان کی جگہ پر) پلٹائیں اور تیرے شہروں میں امن و بہبودی کی صورت پیدا کریں تاکہ تیرے ستم رسیدہ بندوں کو کوئی کھٹکا نہ رہے اور تیرے وہ احکام پھر سے جاری ہو جائیں جنہیں بے کار بنا دیا گیا ہے۔"

آیات قرآنی اور احادیث اسلامی ریاست کے مقاصد کا خلاصہ یہ ہے۔

الف : اسلامی ریاست کا سب سے اہم و ارفع و اعلیٰ مقصد انسان کو پستی اور گمراہی سے نکال کر دنیا و آخرت کی سعادت و کمال کی منزل کو جانے والی راہ پر لگانا ہے اور اس سلسلے میں ہر ممکنہ ذرائع و وسائل فراہم کرنا ہے۔ اور ان اسباب و عوامل کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے جو انسانوں کی شقاوت اور بدبختی کا سبب بن سکتے ہیں۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے پیغمبر اسلامؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"لوگو ! میں نے تمہیں ہر اس چیز کی تلقین کی ہے جو تمہیں جنت سے قریب اور جہنم سے دور کرتی ہے۔ اور ہر اس چیز سے منع کیا ہے جو تمہیں جہنم سے قریب اور جنت سے دور کرنے کا موجب ہو۔"

ب : اسلامی ریاست کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد انسانی معاشرے میں عدل و انصاف کا قیام ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد رب العزت ہے

کرے۔

"بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں۔"

(سورہ حدید ۵۷۔ آیت ۲۵)

ج : اسلامی ریاست کا ایک مقصد لوگوں کو صرف خدائے واحد کی پرستش پر ابھارنا ہے اور دوسری ہر قسم کی بندگی و پرستش کی نفی کرنا ہے۔جیسا کہ آیت ہے:

"اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا ہے کہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔"

(سورہ نحل ۱٦۔ آیت ۳٦)

د : اسلامی ریاست کے مقاصد میں گوشہ و کنار عالم میں پھیلے ہوئے تمام لوگوں کو ہر قسم کی اسارت اور بندگی سے نجات دلانا بھی شامل ہے۔ چاہے اس بندگی اور غلامی کی نوعیت اقتصادی ہو،سیاسی ہو یا عسکری ہو۔ارشاد الٰہی ہے۔

"اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔"

(سورہ اعراف ۷۔ آیت ۱۵۷)

ح : انسانوں کے درمیان موجود ہر قسم کے تنازعات کا عدل و انصاف کی رو سے فیصلہ کرنا بھی اسلامی ریاست کا مقصد ہے۔

"پس آپ کے پروردگار کی قسم کہ یہ ہرگز صاحب ایمان نہ بن سکیں گے جب تک آپ کو اپنے اختلافات میں حکم نہ بنائیں۔"

(سورہ نساء ۴۔ آیت ٦۵)

و : ہر قسم کے جہل و خرافات کا خاتمہ اور معاشرے میں علم و دانش اور

فن و حرفت کا فروغ بھی اسلامی ریاست کے مقاصد میں سے ہے۔ جس کے بارے میں ارشاد قدرت ہے:

"ہم نے تمہارے درمیان تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر ہماری آیات تلاوت کرتا ہے۔ تمہیں پاک و پاکیزہ بناتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ سب کچھ بتاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔"

(سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۱۵۱)

کسی بھی معاشرے میں علم و دانش کے فروغ میں سب سے اہم کردار حکومت ہی کا ہوتا ہے۔ اگر کوئی حکومت اپنے اس فریضے سے روگردانی کرتے ہوئے تعلیم کو بھی تجارت قرار دے دے تو علم و دانش کا حصول بھی روپے پیسے کی فراوانی پر موقوف ہو جائے گا۔ اور جو اس جنس کو خریدنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہی اس سے بہرہ اندوز ہو پائے گا' غریب اور بے مایا افراد جہل کے اندھیرے ہی میں بھٹکنے کے لئے رہ جائیں گے۔

ز : اسلامی ریاست کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد رعیت کو اقتصادی خوشحالی کے مواقع کی فراہمی ہے۔

"اور اگر اہل قریہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو ہم ان کے لئے زمین و آسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کو ان کے اعمال کی گرفت میں لے لیا۔"

(سورہ اعراف ۷۔ آیت ۹۶)

حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

"میری ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری تمہاری اقتصادی خوشحالی ہے۔"

(نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۳۴)

۵ : اسلامی ریاست کا ایک اور اہم مقصد انسانوں کے درمیان پائے جانے والے رنگ و نسل، قوم و قبیلہ، علاقہ و زبان جیسے اختلافات کو ختم کرکے انھیں امت واحدہ کے پرچم تلے لے کر آنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے:

"پھر خدا نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے انبیاء بھیجے اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل کی تاکہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کریں۔"

(سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۲۱۳)

نہج البلاغہ میں عدلِ اجتماعی کا تصور

ہم جس موضوع پر گفتگو کا شرف حاصل کر رہے ہیں وہ ہے "نہج البلاغہ میں عدل اجتماعی کا تصور"۔ عدالت اجتماعی کا قیام حکومت الٰہی کا مقصود اولین اور تمام انبیاء کرام کی سعی اور کوشش کا ہدف تھا۔ طرح طرح کے مصائب جھیلنے کے بعد پیغمبر اکرمؐ مدینے میں اسلامی حکومت کے قیام کے ذریعے عدل اجتماعی کے قیام میں کامیاب ہوئے۔

عدالت اجتماعی سے انحراف کا آغاز بھی ہمیشہ حکام ہی کی طرف سے ہوتا ہے اور اس انحراف کو انتہا تک پہنچانے کا سبب بھی ہمیشہ حکام ہی رہے ہیں۔ ایک ایسی صالح انتظامیہ، جس کا انتخاب قرآن وسنت کے مقرر کردہ اصولوں کے تحت ہوا ہو اس انتظامیہ کی ہمیشہ صحیح ڈگر پر چلنے کی ضمانت وہی معاشرہ دے سکتا ہے جو اس نظام کے سائے میں زندگی بسر کر رہا ہو۔ اگر معاشرہ اس انتظامیہ کی حرکات وسکنات اور اصول وآئین کی پابندیوں اور بدعنوانیوں پر نظر رکھے تو یہ نگرانی اس نظام کی بقا کا سبب بنے گی۔ اور اگر معاشرے کے افراد انتظامیہ کے کردار اور حرکات وسکنات کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں اور اس سے لاتعلق ہو جائیں تو وہ انتظامیہ چاہے کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو غیر معصوم کی سربراہی میں ہونے کی وجہ

سے رفتہ رفتہ انحراف کی طرف گامزن ہو جائے گی اور امت کو مصیبت اور فتنہ سے دوچار کر دے گی کیونکہ نہ تو کوئی اس انتظامیہ کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے والا ہے اور نہ ہی کوئی اس کی خواہشات کو کنٹرول کرنے والا۔

جہالت اور بے لگام خواہشات انسان کو فتنہ اور نابودی کے سمندر میں غرق کر دیتی ہیں جبکہ تدبر اور فہم و فراست کے حامل افراد ان خطرات کو پہلے ہی درک کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ابن عباس نے پیغمبرؐ کی رحلت کے دن کو ایک بڑی مصیبت کا پیش خیمہ قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ :

"پنجشنبہ کا دن ایک بڑی مصیبت کا پیش خیمہ تھا کہ جس دن رحمۃ العالمین اس دنیا سے اٹھ گئے"۔

پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد سقیفہ کے دن نص رسولؐ کو پس پشت ڈال کر اور ان کی سنت سے ہٹ کر انتظامیہ کا انتخاب عمل میں آیا اور یہیں سے عدالت اجتماعی کے زریں نظام سے انحراف کا آغاز ہو گیا۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جو بھی انتظامیہ غیر قانونی طریقے پر مسلط ہوتی ہے امت اسے ہمیشہ اپنے اقتدار کے لئے ایک خطرہ اور چیلنج نظر آتی ہے اور وہ اس خطرے سے نمٹنے اور اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے کبھی جبر، کبھی سیاسی رشوت اور کبھی غیر آئینی اور غیر قانونی طریقے استعمال کرتی ہے۔ وہ جس قدر غیر قانونی اقدامات کرتی جاتی ہے اسی قدر امت کی مخالفت اور ناراضگی بڑھتی جاتی ہے۔ کبھی یہ ناراضگی اور مخالفت لوگوں کے دلوں تک محدود رہتی ہے اور کبھی ابھر کر مزاحمت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اپنے خلاف روز افزوں بڑھتی ہوئی اس مزاحمت کو روکنے کے لئے اقتدار پر قابض افراد مزید غیر قانونی راہوں کو اختیار کرتے ہیں۔ اپنی حکومت کو آئینی اور قانونی ثابت کرنے کے لئے کبھی قومی خزانوں (بیت المال) کا منہ کھول دیتے ہیں اور کبھی ذرائع ابلاغ پر مسلط ہو کر جھوٹی خبروں کے ذریعے کام لیا جاتا ہے۔ ماضی میں

جھوٹی اور جعلی احادیث کا سہارا لیتا انہی حربوں میں سے تھا۔ وہ بیت المال جو غریبوں اور مستضعفوں کے لئے ہے حکومت کے محافظوں' مداحوں اور ثناخوانوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ حکمراں اپنے اقتدار کو زیادہ سے زیادہ طول دینے کے لئے عوام میں خوف و دہشت پھیلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سرکاری خزانے (بیت المال) سے اپنی ذاتی سرمایہ کاری کے لئے کثیر رقم بھی مختص کرتے رہتے ہیں تاکہ اقتدار اگر کبھی چھن جائے تو اپنے عیش و عشرت کو جاری رکھ سکیں اور خود ہی نہیں بلکہ اپنے تمام رشتہ داروں کو بھی سرکاری خزانے سے مالامال کرتے رہتے ہیں۔

اس مختصر تمہیدی گفتگو کے بعد اب آیئے دیکھتے ہیں کہ نہج البلاغہ میں مولا امیر المؤمنینؑ عدل سے انحراف کے باریک ترین اسباب و علل کو کس طرح بیان فرماتے ہیں۔

حاکم کا معیار انتخاب علم و عدالت ہے:

حاکم کے لئے معیار انتخاب "علم و عدالت" ہونا چاہئے۔ ہم جب اسلامی حکومت کے حاکم کے انتخاب کے عنوان سے علم و عدالت کی بات کرتے ہیں تو عموماً ہماری سوچ کا محور صرف ایک تاریخی واقعہ ہوتا ہے جس میں علیؑ کو ان کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ بات صرف سقیفہ کی حد تک ہی نہیں بلکہ عدل اجتماعی کے قیام کے لئے جب بھی اور جہاں بھی حاکم کے انتخاب کا مسئلہ ہو علم و عدالت کا معیار ایک لازم اور ناگزیر شرط ہے۔ قانون اور آئین سے نابلد' امور امت سے ناواقف اور وقت کے حالات اور سیاست سے بے بہرہ شخص کیونکر معاشرہ میں عدل قائم کر سکتا ہے؟۔ ہر سطح پر حاکم کے انتخاب کا معیار علم ہونا چاہئے۔ اگر مسئلہ ایک بستی کا ہے' ایک قصبہ کا ہے یا ایک شہر کا ہے تو وہاں کا افسر اعلیٰ اگر

صوبہ کا ہے تو اس کا گورنر اور اگر ایک ملک کا مسئلہ ہے تو وہاں کا سربراہ ایک عالم ہونا چاہئے نہ کہ ایک جاہل کو۔ اگر معاشرے اور امت کے امور کسی ایسے شخص کو سونپ دیئے جائیں کہ جو عالم نہ ہو یا جس کا علم ناقص ہو تو وہ معاشرے اور امت کے حالات اور مسائل کا احاطہ کیسے کر سکے گا؟ اور قانون (شریعت) کا نفاذ کیوں کر کرپائے گا؟ پھر اس کم علمی کا اسکے عدل پر اثر انداز ہونا ایک یقینی امر ہے۔ اس لئے اصول انتخاب کے مطابق ایسے شخص کا انتخاب ہونا چاہئے کہ جو نہ صرف عالم ہو بلکہ سب سے زیادہ عالم کا حامل ہو' اسی کو شریعت کی زبان میں "اعلم" کہتے ہیں۔

چنانچہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

"جو شخص بھی مسلمانوں پر حکومت کے لئے خود کو پیش کرے جبکہ وہ جانتا ہو کہ اس سے بہتر اور افضل فرد (اعلم) موجود ہے تو گویا اس نے خدا اور رسول سے خیانت کی"

(الحیات۔ ج ۲۔ ص ۳۶۲)

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"اے لوگو! تمام لوگوں میں اس خلافت کا اہل وہ ہے جو اس کے نظم و نسق کے برقرار رکھنے کی سب سے زیادہ قوت اور صلاحیت رکھتا ہو اور اس کے بارے میں اللہ کے احکام کو سب سے زیادہ جانتا ہو"۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کسی ایسے حاکم کا تسلط کہ جو عالم نہ ہو یا جس کا علم ناقص ہو' عدل کے قیام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ کا سبب ثابت ہو گا۔

اگر کسی غیر عادل شخص کو امت پر مسلط کر دیا جائے اور اعلم کے مقابلے میں کسی غیر عالم یا کمتر اور ناقص العلم شخص کے ہاتھ میں امت کے امور سونپ دیئے جائیں تو معاشرہ استحصال اور زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

"اگر کوئی شخص کسی قوم کی امامت اور رہبری کرے جبکہ اس سے زیادہ عالم اور فقیہ موجود ہو تو اس امت کے امور ہمیشہ روبہ زوال ہوتے رہیں گے"۔

ایک غیر عادل اور ظالم حکمران نہ صرف خود اپنے لئے بدبختی اور شقاوت مول لیتا ہے بلکہ پوری قوم کو گمراہیوں کے عمیق سمندر میں دھکیل دیتا ہے۔ امام جائر کی نشاندہی کرتے ہوئے مولا امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں:

"اللہ کے نزدیک سب لوگوں سے بدتر وہ ظالم حکمران ہے جو گمراہی میں پڑا ہے اور دوسرے بھی اس کی وجہ سے گمراہی میں پڑیں اور جو (رسولؐ سے) حاصل کی ہوئی سنتوں کو تباہ اور قابل ترک بدعتوں کو زندہ کرے۔ میں نے رسول اللہؐ سے سنا انہوں نے فرمایا کہ قیامت کے دن ظالم کو اس طرح لایا جائے گا کہ نہ اس کا کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی عذر خواہ اور اسے سیدھا جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور وہ اس طرح چکر کھائے گا جس طرح چکی گھومتی ہے اور پھر اسے جہنم کے گھراؤ میں جکڑ دیا جائے گا"۔

(نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۶۲)

حضرت علیؑ کی نظر میں حکومت کا ہدف:

حضرت علیؑ کے نزدیک حصول حکومت کا مقصد جذبہ حب جاہ اور حب اقتدار کی تسکین نہیں ہے بلکہ ان اعلیٰ ترین الٰہی مقاصد کی تکمیل اور ان امانتوں کی

حفاظت ہے کہ جن کے لئے خداوند عالم نے انسان کو زمین پر خلیفہ بنایا ہے۔
چنانچہ آپؑ فرماتے ہیں :

"بار الٰہا تو خوب جانتا ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہم سے ظاہر ہوا اس لئے نہیں تھا کہ ہمیں تسلط واقتدار کی خواہش تھی یا مال دنیا کی طلب تھی بلکہ یہ اس لئے تھا کہ ہم دین کے نشانات کو (پھر ان کی جگہ پر) پلٹائیں اور تیرے شہروں میں امن و بہبودی کی صورت پیدا کریں تاکہ تیرے ستم رسیدہ بندوں کو کوئی کھٹکا نہ رہے اور تیرے وہ احکام جاری ہو جائیں جنہیں معطل کر دیا گیا ہے"۔

(نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۳۰)

حضرت علیؑ اگر حکومت کے لئے اپنے استحقاق کو پیش کرتے ہیں تو اسی اعلیٰ وارفع ہدف کے حصول اور اپنی الٰہی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے۔ اس خدائی منصب کے لئے جب آپ نے لوگوں کے سامنے اپنا حق پیش کیا تو اس یقین کے ساتھ کہ رسولؐ کے بعد قوم کو صحیح راہ پر چلانے اور انحراف سے محفوظ رکھنے کے لئے علیؑ کے سوا کوئی اہل ترین فرد نہیں۔ چنانچہ آپؑ فرماتے ہیں :

"اللہ تمہیں سمجھے۔ کیا میرے علاوہ اور کسی امام کے امیدوار ہو جو تمہیں سیدھی راہ پر چلائے اور صحیح راستہ دکھائے ؟"

(نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۸۰)

دنیا نے علیؑ پر حریصِ حکومت ہونے کی تہمت لگائی لیکن علیؑ نے دکھا دیا کہ ان کی نظر میں حکومت کی قیمت اپنی خستہ و شکستہ جوتی کے برابر بھی نہیں۔ علیؑ نے اگر اپنا استحقاق پیش کیا تو حکومت کی لالچ اور طمع میں نہیں بلکہ اپنی الٰہی ذمہ داریوں کے پیش نظر اور صرف اتمام حجت کے لئے۔ اس کا واضح ترین ثبوت یہ

ہے کہ جب اس حکومت کہ جس کا تصور اسلام اور قرآن پیش کرتا ہے کے خدوخال مسخ کرنے کے بعد چوتھے دور میں علیؑ کو حکومت پیش کی جانے لگی تو آپؑ یہ کہتے ہوئے اسے قبول کرنے سے انکار فرماتے ہیں "مجھے چھوڑ دو اور جاؤ کسی اور کو پکڑ لو"۔ لیکن جب چاروناچار لوگ آپؑ کے ہاتھ پر بیعت کے لئے امڈ پڑتے ہیں تو آپؑ جس احساس مسئولیت کے ساتھ اس ذمہ داری کو قبول فرماتے ہیں اس کا اندازہ آپؑ کے ان کلمات سے ہوتا ہے:

"خدا کی قسم! مجھے تو کبھی اپنے لئے خلافت اور حکومت کی حاجت و تمنا نہیں رہی۔ تم ہی لوگوں نے مجھے اس کی طرف دعوت دی اور اس پر آمادہ کیا۔ چنانچہ جب وہ مجھ تک پہنچ گئی تو میں نے اللہ کی کتاب کو نظر میں رکھا اور جو لائحہ عمل اس نے ہمارے سامنے پیش کیا اور جس طرح فیصلہ کرنے کا اس نے حکم دیا میں اسی کے مطابق چلا اور جو سنت پیغمبرؐ قرار پائی اس کی پیروی کی"۔

(نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۰۳)

حضرت علیؑ کی نظر میں ایک صحتمند انتظامیہ کا خاکہ:

مولا امیر المؤمنینؑ اسلامی حکومت کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرنا چاہتے تھے لیکن دنیا پرست، جاہ طلب اور حرص وہوس کے غلام خصوصاً پچھلی حکومتوں کے بگڑے ہوئے لوگ کسی طور پر بھی اسے برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ علیؑ جس عادلانہ نظام کا قیام چاہتے تھے اس کے لئے ایک ایسی صاف ستھری انتظامیہ کی ضرورت تھی جو عادل ہو، ظلم وجور سے پاک ہو، راشی، خوشامد پسند اور حریص نہ ہو اور جو ایسے افراد پر مشتمل ہو جن کا معیار زندگی عوام کی سطح سے بالا نہ ہو اور عدل کے تقاضوں کو پورا کرتی ہو:

انتظامیہ عدل کے تقاضوں کو پورا کرتی ہو :

اسلامی حکومت کی انتظامیہ کو نہ صرف انصاف پسند ہونا چاہئے بلکہ اسے عدل کے تقاضوں سے کماحقہ واقفیت بھی حاصل ہونا چاہئے' جو انتظامیہ ظالم ہو اس سے عدل اجتماعی کے قیام کی امیدیں کیوں کر وابستہ کی جاسکتی ہیں ؟ چنانچہ امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں :

"لوگوں میں جو ظالم ہو اس کی تین علامتیں ہیں۔ وہ ظلم کرتا ہے اپنے سے بالا ہستی کی خلاف ورزی سے اور اپنے سے پست لوگوں پر قہر و تسلط سے اور ظالموں کی کمک و امداد کرتا ہے"۔

(کلمات قصار ۳۵۰ ۔ نہج البلاغہ)

اور دوسری جگہ ظلم کی مذمت میں آپؑ فرماتے ہیں :

"خدا کی قسم مجھے کانٹوں پر جاگتے ہوئے رات گزارنا اور طوق زنجیر میں مقید ہو کر گھسیٹا جانا اس سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے اس حالت میں ملاقات کروں کہ میں نے کسی بندے پر ظلم کیا ہو یا مال دنیا میں سے کوئی چیز غصب کی ہو۔ میں اس نفس کی خاطر کیوں کر کسی پر ظلم کر سکتا ہوں جو جلد ہی فنا کی طرف پلٹنے والا اور مدتوں مٹی کے نیچے پڑا رہنے والا ہے"۔

(نہج البلاغہ ۔ خطبہ ۲۲۱)

ظالم کی عاقبت کے بارے میں آپؑ کا ارشاد ہے :

"ظالم کے لئے انصاف کا دن اس سے زیادہ سخت ہوگا جتنا مظلوم پر ظلم کا دن تھا"۔

(کلمات قصار نمبر ۳۴۱)

حضرتؑ نے عبداللہ ابن عباس کی قائم مقامی میں جب زیاد ابن ابیہ کو فارس اور اس کے ملحقہ علاقوں پر عامل مقرر کیا تو ایک باہمی گفتگو کے دوران آپؑ نے اسے پیشگی مال گزاری وصول کرنے سے منع فرمایا۔ اور کہا:

"عدل کی روش پر چلو' بے راہ روی اور ظلم سے کنارہ کشی کرو۔ کیونکہ بے راہ روی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انہیں گھربار چھوڑنا پڑے گا اور ظلم انہیں تلوار اٹھانے کی دعوت دے گا"۔

(کلمات قصار نمبر ۴۷۶)

حضرت علیؑ اس عالم میں بھی عدل کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے کہ جب آپؑ ابن ملجم کی تلوار سے زخمی ہو کر انتہائی کرب اور جانکنی کے عالم میں تھے۔ آپؑ اپنے فرزندوں کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اے عبدالمطلب کے بیٹو! ایسا نہ ہونے پائے کہ تم "امیر المومنین قتل ہوگئے"۔ "امیر المومنین قتل ہوگئے" کے نعرے لگاتے ہوئے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنا شروع کردو۔

دیکھو میرے بدلے میں صرف میرا قاتل ہی قتل کیا جائے اور دیکھو! جب میں اس ضرب سے مرجاؤں تو اس ایک ضرب کے بدلے میں ایک ہی ضرب لگانا اور اس شخص کے ہاتھ پیر نہ کاٹنا' کیونکہ میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے سنا ہے کہ خبردار کسی کے بھی ہاتھ پیر نہ کاٹنا اگرچہ وہ کاٹنے والا کتا ہی ہو"۔

(مکتوب نمبر ۴۷)

ایک مثالی معاشرے کا قیام اسی وقت ممکن ہے کہ جب عدل کے تمام تقاضے پورے کئے جائیں۔ کسی معاشرے میں تمام خوبیاں موجود ہوں' تمام آسائشیں

میسر ہوں' مال و دولت کی فراوانی ہو لیکن اگر یہ سب کچھ عدل و اعتدال کے ساتھ نہ ہو تو اسے ویسا مثالی معاشرہ نہیں قرار دیا جاسکتا جس کا تصور اسلام پیش کرتا ہے۔ سخاوت اگرچہ ایک پسندیدہ عمل ہے لیکن امیر المومنین امام علیؑ سے جب پوچھا گیا کہ مولا! عدل بہتر ہے یا سخاوت؟ تو آپؑ نے فرمایا:

"عدل تمام امور کو ان کے موقع و محل پر رکھتا ہے اور سخاوت ان کو ان کی حدود سے باہر کر دیتی ہے' عدل سب کی نگہداشت کرنے والا ہے اور سخاوت اس سے مخصوص ہوتی ہے جسے دیا جائے لہٰذا عدل' سخاوت سے بہتر ہے"۔

(کلمات قصار نمبر ۴۳۶)

"حکام کا رویہ عوام کے ساتھ یکساں ہونا چاہئے:

ایک اسلامی حکومت میں حاکم کے لئے ضروری ہے کہ عوام سے اس کا سلوک اور برتاؤ بغیر کسی امتیاز کے یکساں ہو اور وہ سب کو ایک نظر سے دیکھے۔ چنانچہ محمد ابن ابی بکر جب مصر کے گورنر ہوئے تو امیر المومنینؑ نے انہیں لکھا:

"لوگوں سے تواضع کے ساتھ ملنا' ان سے نرمی کا برتاؤ کرنا' کشادہ دلی سے پیش آنا اور سب کو ایک نظر سے دیکھنا تاکہ بڑے لوگ تم سے اپنی ناحق طرفداری کی امید نہ رکھیں اور چھوٹے لوگ ان (بڑوں) کے مقابلہ میں تمہارے عدل و انصاف سے ناامید نہ ہو جائیں۔ کیونکہ اللہ کے بندو! اللہ تمہارے چھوٹے بڑے' کھلے ڈھکے اعمال کی تم سے باز پرس کرے گا اور اس کے بعد اگر وہ معاف کردے تو یہ اس کے کرم کا تقاضہ ہے"۔

(مکتوب نمبر ۲۷)

رشوت خور انتظامیہ، قیام عدل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے:

کسی معاشرے میں قیام عدل کی راہ میں بڑی رکاوٹوں میں سے ایک رکاوٹ رشوت ہے۔ اگر انتظامیہ رشوت خور اور بدعنوان ہو تو رشوت دینے والے افراد تو جائز و ناجائز تمام مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن حقدار ہمیشہ اپنے حق سے محروم رہتے ہیں۔ امیر المؤمنین علیؑ ابن ابیطالبؑ نے جس انداز سے اس فاسد عنصر کی مذمت فرمائی ہے وہ درس عبرت ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں :

"اس سے عجیب تر واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص رات کے وقت (شہد میں) گندھا ہوا حلوا ایک سربند برتن میں لئے ہوئے ہمارے گھر پر آیا جس سے مجھے ایسی نفرت ہوئی کہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ سانپ کے تھوک یا اس کی قے میں گوندھا گیا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ کیا یہ کسی بات کا انعام ہے یا زکوۃ ہے یا صدقہ ہے؟ تو اس نے کہا کہ نہ یہ ہے نہ وہ ہے بلکہ یہ تحفہ ہے۔ تو میں نے کہا کہ پسر مردہ عورتیں تجھ پر روئیں، کیا تو دین کی راہ سے مجھے فریب دینے آیا ہے، کیا تو بہک گیا ہے، پاگل ہو گیا ہے، یا یونہی ہذیان بک رہا ہے۔ خدا کی قسم اگر ہفت اقلیم ان چیزوں سمیت جو آسمانوں کے نیچے ہیں مجھے دے دیئے جائیں کہ میں اللہ کی صرف اتنی معصیت کروں کہ چیونٹی سے جو کا ایک چھلکا چھین لوں تو کبھی بھی ایسا نہ کروں گا۔"

انتظامیہ کو اپنا معیار زندگی عوام کے مستضعف ترین افراد کی سطح پر رکھنا چاہیے:

جس مثالی انتظامیہ کا تصور علیؑ پیش فرماتے ہیں اس کے لئے وہ لازم قرار

دیتے ہیں کہ ان کا معیار زندگی مفلس اور نادار لوگوں کی سطح سے بلند نہ ہو' تاکہ نادار لوگوں کو اپنی مفلسی کا احساس کم ہو۔ ایک مرتبہ لوگوں نے آپؑ کی تاسی میں موٹا' چھوٹا لباس پہننے اور روکھا سوکھا کھانا اختیار کیا تو آپؑ نے فرمایا :

"تم پر حیرت ہے میں تمہارے مانند نہیں ہوں۔ خدا نے ائمہ حق پر فرض کیا ہے کہ وہ اپنے کو مفلس اور نادار لوگوں کی سطح پر رکھیں تاکہ مفلوک الحال اپنے فقر کی وجہ سے پیچ و تاب نہ کھائے۔" (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۰۷)

اپنے ایک خط میں عثمان ابن حنیف کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں :

"اے ابن حنیف ! مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بصرہ کے جوانوں میں سے ایک شخص نے تمہیں کھانے پر بلایا اور تم لپک کر پہنچ گئے کہ رنگا رنگ کے عمدہ کھانے تمہارے لئے چن چن کر لائے جا رہے تھے اور بڑے بڑے پیالے تمہاری طرف بڑھائے جا رہے تھے۔ مجھے امید نہ تھی کہ تم ان لوگوں کی دعوت قبول کر لوگے کہ جن کے یہاں سے فقیر و نادار دھتکارے گئے ہوں اور دولتمند مدعو ہوں۔ جو لقمے چباتے ہو انہیں دیکھ لیا کرو اور جس کے متعلق شبہ بھی ہو اسے چھوڑ دیا کرو اور جس کے پاک و پاکیزہ طریقہ سے حاصل ہونے کا یقین ہو اس میں سے کھایا کرو۔" (مکتوب ۴۵۔ نہج البلاغہ)

اقرباپروری۔ قیام عدل کی راہ میں رکاوٹ ہے:

جس طرح رشوت' خوشامد اور چاپلوسی اسلامی معاشرے کے لئے مہلک ہیں' اسی طرح اقربا پروری بھی قیام عدل کی راہ میں ہمیشہ ایک بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی ہے جس سے لوگوں میں احساس محرومی پیدا ہوتا ہے۔ علیؑ قیام عدل کی راہ میں اپنے سگے بھائی عقیل تک کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ چنانچہ آپؑ

فرماتے ہیں :

"بخدا میں نے اپنے بھائی عقیل کو سخت فقر و فاقہ کی حالت میں دیکھا، یہاں تک کہ وہ تمہارے (حصے کے) گیہوں میں سے ایک صاع مجھ سے مانگتے تھے اور میں نے ان کے بچوں کو دیکھا جن کے بال بکھرے ہوئے اور فقر و بے نوائی سے رنگ تیرگی مائل ہو چکے تھے گویا ان کے چہرے نیل چھڑک کر سیاہ کر دیئے گئے ہیں۔ وہ اصرار کرتے ہوئے میرے پاس آئے اور اس بات کو بار بار دہرایا۔ میں نے ان کی باتوں کو کان دے کر سنا تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ میں ان کے ساتھ اپنا دین بیچ ڈالوں گا اور اپنی روش چھوڑ کر ان کی کھینچ تان پر ان کے پیچھے ہو جاؤں گا۔ مگر میں نے کیا یہ کہ ایک لوہے کے ٹکڑے کو تپایا اور پھر ان کے جسم کے قریب لے گیا تاکہ عبرت حاصل کریں۔ چنانچہ وہ اس طرح چلائے جس طرح کوئی بیمار درد و کرب سے چیختا ہے اور قریب تھا کہ ان کا بدن اس داغ دینے سے جل جائے۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ اے عقیل ! رونے والے تم پر روئیں کیا تم اس لوہے کے ٹکڑے سے چیخ اٹھے ہو جسے ایک انسان نے ہنسی مذاق میں (بغیر جلانے کی نیت سے) تپایا ہے اور تم مجھے اس آگ کی طرف کھینچ رہے ہو جسے خدائے قہار نے اپنے غضب سے بھڑکایا ہے، تم تو اذیت سے چیخو اور میں جہنم کے شعلوں سے۔"

حکومت کو بخیل نہیں ہونا چاہیے:

حضرت علیؑ جہاں بیت المال کی حفاظت میں اتنے سخت ہیں کہ اپنے سگے بھائی تک کو ان کے حق سے زیادہ ایک درہم دینے کے روادار نہیں، وہاں اس حق میں بھی نہیں کہ حکومت بخیل ہو اور عوام کی فلاح و بہبود میں بھی خرچ کرنے سے بخل کرے۔ آپؑ اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :

"اپنے مشوروں میں کسی بخیل کو شریک نہ کرنا کہ وہ تمہیں دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے سے روکے گا اور فقر و افلاس کا خطرہ دلائے گا۔ اور نہ کسی بزدل سے مہمات میں مشورہ لینا کہ وہ تمہاری ہمت پست کر دے گا۔ اور نہ کسی لالچی سے مشورہ کرنا کہ وہ ظلم کی راہ سے مال بٹورنے کو تمہاری نظروں میں سجا دیگا۔ یاد رکھو کہ بخل، بزدلی اور حرص اگرچہ الگ الگ خصلتیں ہیں مگر اللہ سے بدگمانی ان سب میں مشترک ہے۔"

ایک دوسرے موقعہ پر آپؑ فرماتے ہیں :

"نیک بندوں کے نزدیک فرمانرواؤں کی ذلیل ترین صورت حال یہ ہے کہ ان کے متعلق یہ گمان ہونے لگے کہ وہ فخر و سربلندی کو دوست رکھتے ہیں اور ان کے حالات کبر و غرور پر محمول ہیں۔ مجھے یہ تک ناگوار معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اس کا وہم و گمان بھی گزرے کہ میں بڑھ چڑھ کر سراہے جانے یا تعریف سننے کو پسند کرتا ہوں۔ بحمد اللہ اکبر میں ایسا نہیں ہوں۔ اور اگر مجھے اس کی خواہش بھی ہوتی کہ ایسا کہا جائے تو بھی اللہ کے سامنے فروتنی کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیتا کہ ایسی عظمت و بزرگی کو اپنایا جائے کہ جس کا وہی اہل ہے۔ یوں تو لوگ اکثر اچھی کارکردگی کے بعد مدح و ثنا کو خوشگوار سمجھا کرتے ہیں لیکن میری اس پر مدح و ستائش نہ کرو کہ اللہ کی اطاعت اور تمہارے حقوق سے عہدہ برآ ہوا ہوں۔ کیونکہ ابھی ان حقوق کا ڈر ہے کہ جنہیں پورا کرنے سے میں ابھی فارغ نہیں ہوا اور ان کا ابھی اندیشہ ہے کہ جن کا نفاذ ضروری ہے۔ مجھ سے ویسی باتیں نہ کیا کرو جیسی جابر و سرکش فرمانرواؤں سے کی جاتی ہیں۔ اور نہ مجھ سے اس طرح بچاؤ کرو جس طرح طیش کھانے والے حاکموں سے بچاؤ کیا جاتا ہے اور مجھ سے اس طرح میل جول نہ رکھو جس سے چاپلوسی اور خوشامد کا پہلو نکلتا ہو۔ میرے متعلق یہ گمان نہ کرو کہ میرے

سامنے کوئی حق کی بات کہی جائے گی تو مجھے گراں گزرے گی اور نہ یہ خیال کرو کہ میں یہ درخواست کروں گا کہ مجھے بڑھا چڑھا دو کیونکہ جو اپنے سامنے حق کے کہے جانے اور عمل کے پیش کئے جانے کو بھی گراں سمجھتا ہو اسے حق اور انصاف پر عمل کرنا کہیں زیادہ دشوار معلوم ہوگا۔ تم اپنے کو حق کی بات کہنے اور عدل کا مشورہ دینے سے نہ روکو کیونکہ میں تو اپنے کو اس سے بالاتر نہیں سمجھتا کہ خطا کروں اور نہ اپنے کسی کام کو لغزش سے محفوظ سمجھتا ہوں۔ مگر یہ کہ خدا میرے نفس کو اس سے بچائے کہ جس پر وہ مجھ سے زیادہ اختیار رکھتا ہے۔ ہم اور تم اس رب کے بے اختیار بندے ہیں کہ جس کے علاوہ کوئی رب نہیں۔ وہ ہم پر اتنا اختیار رکھتا ہے کہ خود ہم اپنے نفسوں پر اتنا اختیار نہیں رکھتے۔ اسی نے ہمیں پہلی حالت سے نکال کر کہ جس میں ہم تھے بہبودی کی راہ پر لگایا اور اسی نے ہماری گمراہی کو ہدایت سے بدلا اور بے بصیرتی کے بعد بصیرت عطا کی۔" (خطبہ ۔ ۲۱۴ ۔ نہج البلاغہ)

انسان فطرتاً خود پسند واقع ہوا ہے۔ عجب اور خود پسندی ایسی لعنت ہے جو کئی برائیوں کو جنم دیتی ہے۔ جہاں روپیہ پیسہ، تحفے تحائف اور رشوت سے کام چلتا ہے وہاں بہت سے کام خوشامد اور چاپلوسی سے بھی انجام پاتے ہیں۔ اسلامی حکومت کے لئے علیؑ جس انتظامیہ کو چاہتے ہیں وہ ایک ایسی انتظامیہ ہے جو اس برائی سے پاک ہو اور جسے خوشامد اور چاپلوسی متاثر نہ کر سکتی ہو۔ چنانچہ آپؑ نے مختلف مواقع پر ابتدائی مرحلے ہی میں اس برائی کو کچلنے کی کوشش کی۔ جیسا کہ ایک مرتبہ جب کچھ لوگوں نے آپؑ کے روبرو آپؑ کی مدح و ستائش کی تو آپؑ نے فرمایا:

"اے اللہ! تو مجھے مجھ سے بھی زیادہ جانتا ہے اور ان لوگوں سے زیادہ اپنے نفس کو میں پہچانتا ہوں۔ اے خدا! جو ان لوگوں کا خیال

ہے ہمیں اس سے بہتر قرار دے اور ان لغزشوں کو بخش دے جن کا انہیں علم نہیں ہے۔"

ایک مرتبہ حضرت شام کی جانب روانہ ہوئے تو ایک مقام پر جائر کے زمینداروں کا سامنا ہوا۔ آپ کو دیکھ کر وہ لوگ پیادہ ہو گئے اور آپ کے سامنے دوڑنے لگے۔ انہیں دیکھ کر آپ نے فرمایا :

"یہ تم نے کیا کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہمارا عام طریقہ ہے جس سے ہم اپنے حکمرانوں کی تعظیم بجا لاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ! خدا کی قسم اس سے تمہارے حکمرانوں کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچتا۔ البتہ تم اس دنیا میں اپنے کو زحمت و مشقت میں ڈالتے ہو اور آخرت میں اس کی وجہ سے بدبختی مول لیتے ہو۔ وہ مشقت کتنی گھاٹے والی ہے جس کا نتیجہ سزائے اخروی ہو اور وہ راحت کتنی فائدہ مند ہے جس کا نتیجہ دوزخ سے امان ہو۔" (کلمات قصار نمبر ۳۷۔ نہج البلاغہ)

حضرت علیؑ کی حکومت کا منشور:

اسلام کے عادلانہ نظام حکومت کی بنیاد ہی ہمیشہ اعلیٰ اصولوں پر استوار ہوتی ہے۔ نہ تو عوام کو سبز باغ دکھا کر کسی خوش فہمی میں رکھنا ان کے اصولوں میں شامل ہے اور نہ ہی تاریکی میں بے خبر رکھنا۔ چنانچہ آپ نے اسی دن جب لوگوں نے قتل عثمانؓ کے بعد آپ کی بیعت کا ارادہ کیا' لوگوں کو جھوٹے وعدوں پر رکھنے یا سبز باغ دکھانے (جیسا کہ آج کل حکومت و اقتدار کے حریصوں کا طریقہ ہے) کی بجائے صاف الفاظ میں اپنے منشور کا اعلان کر دیا تاکہ حق مانگنے والے بغیر کسی خوف و جھجک کے اطمینان سے آگے بڑھیں اور ناپاک عزائم رکھنے والے پہلے ہی اپنا راستہ علیحدہ اختیار کر لیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں :

"مجھے چھوڑ دو اور میرے علاوہ (اس خلافت کے لئے) کوئی اور ڈھونڈ

لو۔ ہمارے سامنے ایک ایسا معاملہ ہے جس کے کئی رخ ہیں' کئی رنگ ہیں' جسے نہ دل برداشت کرسکتے ہیں اور نہ عقلیں اسے مان سکتی ہیں۔ دیکھو افق عالم پر گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں' راستہ پہچاننے میں نہیں آتا' تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اگر میں تمہاری اس خواہش کو مان لوں تو تمہیں اس راستے پر لے چلوں گا جو میرے علم میں ہے اور اس کے متعلق کسی کہنے والے کی بات اور کسی ملامت کرنے والے کی سرزنش پر کان نہیں دھروں گا۔ اور اگر تم میرا پیچھا چھوڑ دو تو پھر جیسے تم ہو ویسا میں ہوں اور ہو سکتا ہے کہ جسے تم امیر بناؤ اس کی میں تم سے زیادہ سنوں اور مانوں اور میرا (تمہارے دنیاوی مفاد کے لئے) امیر ہونے سے وزیر ہونا بہتر ہے۔" (نہج البلاغہ۔ خطبہ نمبر۹۰)

اس عادلانہ نظام میں "کچھ لو اور کچھ دو" کے دنیاوی اصول پر نہ سودے بازی ممکن ہے اور نہ ہی بدعنوان (Corrupt) انتظامیہ کے جرائم سے چشم پوشی۔ نہ گزشتہ حکومتوں کے اعمال و کرتوت احتساب سے بالاتر ہیں اور نہ موجودہ حکومت کے افراد اس سے بری ہیں۔ یہاں کرسی اقتدار پر بیٹھے ہوئے چہروں کو ہی بدل دینا کافی نہیں ہے بلکہ بدعنوان انتظامیہ کے پورے ڈھانچے کو بدلنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بنی عباس کے زمانے میں امام ہشتم امام رضاؑ کو خلافت کی پیشکش کی گئی تو آپؑ نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اسی طرح آپؑ کے جد امیرالمومنین امام علیؑ بھی ان حقائق کا بدرجہ اتم ادراک رکھتے تھے۔ چنانچہ لوگوں نے جب مدینہ میں آپؑ کے ہاتھ پر بیعت کی تو آپؑ نے ببانگ دہل لوگوں کو متنبہ کردیا کہ وہ کان کھول کر سن لیں کہ رسولؐ کی آنکھ بند ہونے کے بعد وہ جس ڈگر اور راہ پر چل نکلے تھے انہیں اس سے واپس پلٹنا پڑے گا اور اسی راہ پر آنا ہوگا جو رسول اکرمؐ کی راہ تھی۔ آپؑ نے صاف صاف لفظوں میں اپنی پالیسی کا اعلان کردیا کہ علیؑ سے یہ توقع نہ رکھیں کہ وہ

"کچھ لو اور کچھ دو" کے دنیاوی اصولوں پر سابقہ حکومتوں کے افراد کو سیاسی رشوت کے طور پر کچھ عہدوں کی پیشکش کرے گا۔ یا ان کے لئے قومی خزانوں (بیت المال) کے دروازوں کو کھول دے گا جیسا کہ معاویہ ابن ابی سفیان نے عمرو ابن عاص کے ساتھ معاملہ کیا۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپؑ فرماتے ہیں :

"اس نے اس وقت تک معاویہ کی بیعت نہیں کی کہ جب تک یہ شرط اس سے منوا نہ لی کہ وہ اس بیعت کی قیمت ادا کرے۔" (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۶)

بلکہ اس کے برعکس علیؑ نے واضح لفظوں میں بتلایا کہ سابقہ حکومتیں جن بدعنوانیوں کی مرتکب ہوئی ہیں انہیں ہر حال میں احتساب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور جو افراد قرآن اور سنت کے معیار کے خلاف کسی منصب پر آگئے ہیں میری حکومت میں وہ ان منصبوں پر باقی نہیں رہ سکیں گے اس لئے کہ یہ الٰہی امانت ہے۔ چنانچہ بدعنوان انتظامیہ کی تطہیر (Screening) کے پروگرام کا اعلان کرتے ہوئے آپؑ فرماتے ہیں :

"میں اپنے قول کا ذمہ دار ہوں اور اس کی صحت کا ضامن ہوں۔ جس شخص کو اس کے دیدہ عبرت نے گزشتہ عقوبتیں واضح طور سے دکھا دی ہوں وہ اسے تقویٰ شبہات میں اندھا دھند کودنے سے روک لیتا ہے۔ تمہیں جاننا چاہئے کہ تمہارے لئے وہی ابتلائیں پلٹ آئی ہیں جو رسولؐ کی بعثت کے وقت تھیں۔ اس ذات کی قسم ! جس نے رسولؐ کو حق و صداقت کے ساتھ بھیجا تمہاری اس طرح تطہیر کی جائے گی جس طرح چھلنی سے کسی چیز کو چھانا جاتا ہے۔ تمہیں اس طرح تہ و بالا کیا جائے گا جس طرح چمچے سے ہنڈیا (میں پکانے والی چیز کو کیا جاتا ہے) یہاں تک کہ جو نیچے ہیں وہ اوپر اور جو اوپر ہیں وہ نیچے چلے جائیں گے۔ جنہیں

پیچھے کر دیا گیا تھا وہ آگے لائے جائیں گے اور جنہیں آگے بڑھا دیا گیا تھا وہ پیچھے چلے جائیں گے۔ خدا کی قسم! میں نے کوئی بات پردے میں نہیں رکھی اور نہ کبھی کذب بیانی سے کام لیا۔" (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۶)

اپنے احتسابی پروگرام کا اعلان کرتے ہوئے آپؑ فرماتے ہیں:

"خدا کی قسم! اگر مجھے ایسا مال بھی کہیں نظر آیا جو عورتوں کے مہر اور کنیزوں کی خریداری پر صرف کیا جا چکا ہے تو اسے بھی واپس پلٹاؤں گا چونکہ عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے میں وسعت ہے اور جسے عدل کی صورت میں تنگی محسوس ہو اسے ظلم کی صورت میں اور تنگی محسوس ہو گی۔"

آپؑ نے نہ صرف ماضی میں کی گئی بدعنوانیوں کے احتساب کا اعادہ کیا بلکہ آئندہ کے لئے بھی علیؑ کی حکومت میں اگر کسی کے دل میں کوئی لالچ یا طمع رہی ہو تو اس کی آرزوؤں پر بھی آپؑ نے یہ کہہ کر ہمیشہ کے لئے پانی پھیر دیا کہ:

"کیا تم مجھ پر یہ امر عائد کرنا چاہتے ہو کہ میں جن لوگوں کا حاکم ہوں ان پر ظلم و زیادتی کر کے (کچھ لوگوں کی) امداد حاصل کروں۔ تو خدا کی قسم جب تک دنیا کا قصہ چلتا رہے گا اور کچھ ستارے دوسرے ستاروں کی طرف جھکتے ہی رہیں گے میں اس چیز کے قریب بھی نہیں پھٹکوں گا۔ اگر خود میرا مال ہوتا تب بھی میں اسے سب میں برابر تقسیم کرتا۔ چہ جائے کہ یہ مال اللہ کا مال ہے۔"

لیکن سابقہ دور میں جب لوگ اتنا بگڑ چکے ہوں کہ تمام ناجائز مراعات کو اپنا حق سمجھتے ہوں اور بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہوں وہاں وہ علیؑ کے اس سخت محاسبہ کو گوارا کرنے کے کیسے متحمل ہو سکتے تھے!؟

فلسفۂ انتظار اور ولایتِ فقیہ

"ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی
الارض ونجعلھم ائمہ ونجعلھم الوارثین ○"

امامؑ مستضعفین کی ولادت باسعادت کے موقع پر ہم مستضعفین عالم کی خدمت میں جو اپنے امامؑ کے انتظار میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہی بشارت دیتے ہیں جو اللہ نے اپنے کلام پاک میں مستضعفین کو دی ہے۔ وہ بشارت یہ ہے کہ ـــــ "ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ہم مستضعفین پر احسان کریں گے اور ان کو زمین میں امام و مقتداء بنائیں گے، نیز ان کو زمین کا وارث بنائیں گے"۔ جب کہ اس زمین پر ظالمین و غاصبین و جابرین کا قبضہ ہے۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا : "اللہ تعالیٰ نے مومنین سے وعدہ کیا ہے کہ ان ہی میں سے خلیفہ بناؤں گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا اور ان ہی کو تمکن اور قدرت دوں گا۔ ان سے تمام خوف و ہراس کو دور کردوں گا اور امن و چین کی زندگی بسر کرنے کا موقع دوں گا اور تنہا میری پرستش ہوگی"۔

یہ بشارت ہر مستضعف کے لئے نہیں ہے کیونکہ بہت سے مستضعفین ظالم کے ساتھ ہیں اور ان کے ظلم میں برابر کے شریک ہیں بلکہ ان مستضعفین سے خطاب ہے جو اپنے آپ کو اس ظلم و ستم سے نکالنے کے لئے تیار ہیں اور ان ظالموں کی بیخ کنی اور ان کے زوال کے لئے کوشاں ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ اپنے مستقبل کو واضح اور روشن دیکھتے ہیں کیونکہ وہ ایک ایسی حکومت کا انتظار کر رہے ہیں' وہ اس امام کا انتظار کر رہے ہیں جس کا تمام دنیا انتظار کر رہی ہے۔ یہی انتظار ان کو درخشاں مستقبل کی طرف دعوت دیتا ہے اور امید دلاتا ہے۔ یہاں بہتر ہو گا کہ ہم آپ کے سامنے فلسفہ انتظار کو واضح اور روشن کریں۔

فلسفہ انتظار امامؑ

جس طرح ہمارے دوسرے مفاہیم اسلامی کو استعمار نے الٹا اور مخدوش کر کے پیش کیا اسی طرح وہ فلسفہ انتظار امام کے مفہوم کو پہلے غلط پیش کرتا ہے' اس کے بعد اس پر اعتراضات کرتا ہے اور غلط تبصرے کرتا ہے۔ اعتراض یوں کیا جاتا ہے کہ :

○ ۔ آئندہ آنے والے زمانے سے ہمیں کیا فائدہ ہو گا' ہم تو بدبختی سے گزر رہے ہیں۔

○ ۔ اگر آئندہ زمانہ اچھا ہو گا تو ان لوگوں کے لئے ہو گا جو اس وقت زندہ ہوں گے' ہمارے لئے کیا ہو گا؟

○ ۔ اس انتظار سے قابلیت و صلاحیت میں جمود و رکود پیدا ہو گا۔

○ ۔ یہ محرومین اور مظلومین اور ستم رسیدہ لوگوں کو پلائی جانے والی افیون ہے۔

کچھ لوگ انتظار بھی کرتے ہیں' دعا بھی کرتے ہیں لیکن مفہوم انتظار سے واقف نہیں ہوتے۔ یہ خشک انتظار ہے۔

یہ سب اصل میں انتظار کو نہیں سمجھے۔ لہٰذا ہمیں سب سے پہلے انتظار کو احادیث انتظار کی روشنی میں دیکھنا ہے اور پھر اس کی روشنی میں تحقیق کرنا ہے تاکہ اشکال اور بے معنی انتظار کے سبب پیدا ہونے والا جمود ختم ہو جائے۔

انتظار امامؑ احادیث کی روشنی میں

جو لوگ حقیقی معنوں میں مہدیؑ موعود کا انتظار کرتے ہیں ایسا ہے گویا وہ خود مہدی زمانؑ کے ہمراہ اس کے فوجی کیمپ میں جنگی نقشہ کھینچ رہے ہوں۔ چنانچہ روایات معصومینؑ میں وارد ہوا ہے کہ:

○ - جو لوگ مہدیؑ موعود کا انتظار کرتے ہیں گویا انہوں نے تلوار اٹھا کر اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا۔

○ - رسول اللہؐ کی قیادت میں جنگ کی۔

○ - امام زمانہؑ کے پرچم کے نیچے ہیں۔

○ - رسول اللہؐ کے ساتھ جنگ میں شہید ہوئے۔

○ - بہترین اعمال آخر زمانہ میں انتظار فرج ہے۔

کیا امام زمانہؑ کے فوجی کیمپ میں امامؑ کے ساتھ نقشہ کھینچنے والے یا ان کے ساتھ تلوار اٹھانے والے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر قیادت جنگ کرنے والے یا ان کے ہم رکاب ہو کر شہید ہونے والے تمام لوگ جمود و رکود کے نمونہ تھے یا تحرک و حرارت کے مظہر۔ ظاہر ہے کہ ایسے فضائل و درجات کسی انسان کو اس وقت تک نہیں ملتے جب تک اس میں تحرک و حرارت نہ ہو۔

دوسرے مرحلے پر :

انتظار وہ شخص کرتا ہے جو موجودہ حالات سے ناراض اور بہتر حالات کی تلاش میں ہو۔ غرض انتظار کے دو پہلو ہوئے۔ ایک منفی یعنی موجودہ حالات سے ناراضگی اور بے چینی۔ اور دوسرے مثبت یعنی بہتر حالات کی تلاش۔

پہلے پہلو کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ شخص ہر قسم کے ظلم و فساد و برائی سے اپنے تعلقات کو ختم کر دے گا اور اپنے آپ کو ان تمام برائیوں سے محفوظ رکھے گا۔ جبکہ دوسرے پہلو کا لازمی اثر یہ ہے کہ ہر وہ کام جو امام کی حکومت کے قیام کے لئے مفید و موثر ثابت ہو' یہ اسے انجام دے گا۔

انتظار کے معنی ہوشیار ہو جاؤ

اگر ہم خود ظالم و جابر ہوں تو اس شخص کا کس طرح انتظار کر سکتے ہیں جس کی تلوار کی پیاس ظالموں کے خون سے بجھے گی۔

ان احادیث اور مفہوم انتظار کی روشنی میں آیئے اب دیکھتے ہیں کہ انتظار کس طرح کیا جانا چاہئے۔

پہلے خود سازی کریں۔ اپنے آپ کو اسلامی اصولوں کے سانچے میں ڈھالیں' اوصاف رزیلہ اور خامیوں کو دور کریں۔ اچھے اوصاف علم و عمل سے آراستہ ہوں تاکہ آپ میں بھی امام زمانہ کے انصار و اعوان میں شامل ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

دوسرے مرحلے پر اپنے سب سے نزدیک شخص کو چاہے اس کا تعلق خاندان سے ہو یا معاشرہ سے' ایسے احباب اور دوستوں کے قریب لائیں جن کی باتوں سے اس کے علم میں اضافہ ہو' جن کے کردار سے اس کے عمل میں پختگی آئے' جن کا دیدار اسے خداوند تعالیٰ اور ائمہ علیہ السلام کی یاد دلائے اور وہ آپ کی دوستی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

تیسرے مرحلہ پر ایک ایسی تنظیم کی تشکیل کی ضرورت ہے جس کی طرف قرآن کریم ہمیں دعوت دے رہا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ ہونا چاہئے جو خیر کی طرف دعوت دے' امر بالمعروف اور نہی ان عن المنکر کرے' یہی لوگ فلاح پانے والے اور نجات پانے والے ہیں۔ جب تک ایسی تنظیم تشکیل نہیں دی

جائے گی انفرادی خدمات ہمیں منزل مقصود تک نہیں لے جا سکتی ہیں۔

آپ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ایک قیادت صالحہ کی تلاش میں رہیں۔ اپنی قیادت ہر شخص کے ہاتھ میں نہ دیں بلکہ ایسی قیادت کی تلاش کریں جو امام زمانہؑ کی مرضی کے مطابق ہو اور یہ قیادت آپ اور آپ کے امام مبینؑ سے رابطہ کے فرائض انجام دے سکے۔

ولایت فقیہ کا تصور

ناسمجھ اور ناواقف حضرات کو تصور ولایت فقیہ ایک نیا تصور نظر آتا ہے اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ انقلاب اسلامی ایران کی پیداوار ہے۔ وہ ولایت فقیہ کو مجتہدوں اور آیت اللہ حضرات کی حکومت تصور کرتے ہیں اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ چونکہ ہمارے یہاں مجتہد اور آیت اللہ کی حکومت ہے لہٰذا ہر آیت اللہ کو حکومت ملنی چاہئے اور اسے اس اقتدار و ریاست عمومی میں برابر کا شریک ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ اور بھی سینکڑوں شکوک و شبہات لوگوں کے دلوں میں موجود ہیں۔ لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ ہم ولایت فقیہ کا تصور تجزیہ و تحلیل کے ساتھ پیش کریں تاکہ یہ شکوک و شبہات دور ہو سکیں۔

ولایت فقیہ دو الفاظ کا مرکب ہے۔

(۱) ولایت۔

(۲) فقیہ۔

سب سے پہلے ان دو الفاظ کے معنی واضح کرنا ضروری ہیں۔

ولایت "ولی" سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز پر قیام کرنا اور کسی چیز پر اختیار حاصل کرنا۔ جیسا کہ آقا اور غلام کے تعلق میں واضح ہے۔ غلام کے تمام اختیارات اس کے مالک کے پاس ہوتے ہیں جنہیں وہ اپنے آقا کی اجازت کے بغیر استعمال نہیں کر سکتا۔ اسی طرح آقا اس کی زندگی کے تمام امور کا ذمہ

دار ہے۔ اسی لئے باپ اور دادا کو بچے کا ولی کہا جاتا ہے۔ اور یتیم کی سرپرستی کرنے والے کو یتیم کا والی کہا جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کسی شخص یا گروہ یا مملکت یا امت کے تمام امور کی نگرانی کرنے والا والی کہا جاتا ہے۔ اسلام میں مسلمانوں کے سربراہ اعلیٰ یا حاکم اعلیٰ کو ولی مسلمین یا اولی الامر کہتے ہیں اور یہی اصطلاح قرآن مجید اور روایات میں استعمال ہوئی ہے۔ اس کے برعکس حاکم اعلیٰ کی اصطلاح قرآن میں استعمال نہیں ہوتی۔ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوا:

"بتحقیق تمہارا ولی اللہ اور اس کا رسولؐ اور وہ شخص ہے جو نماز کو قائم کرتا اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتا ہے۔"

گویا اللہ اور رسولؐ اور حالت رکوع میں زکوۃ دینے والے کو ولی کہا گیا ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہوا۔

"اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسولؐ کی اور اولی الامر کی۔"

(سورۂ نساء ۴۔ آیت ۵۹)

اسی طرح رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آخری خطبہ میں فرمایا:

"کیا میں تمہارے جان و مال پر اختیار نہیں رکھتا ہوں۔"

اس سے واضح ہوا کہ ولی مسلمین اور اولی الامر کے معنی سربراہ اعلیٰ کے ہیں جو تمام اختیارات کا مالک ہے۔

یہ ہیں ولایت کے معنی۔ ولایت کے اور معنی بھی ہیں لیکن سب کے سب ایک ہی تصور پر گھومتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ کسی چیز یا فرد پر اچھے طریقہ سے قیام کرنا اور اس پر تصرف کرنا۔

لغت عرب میں "فقہ" کے معنی فہم کے ہیں جو علم کے معنی سے ملتے ہیں۔ علم کے معنی ہیں ذہن میں کسی چیز کا تصور آنا۔ گویا کسی چیز کے جاننے کو علم کہتے ہیں لیکن فقہ علم کو صحیح معنوں میں سمجھنا اور اس کے حدود و خصوصیات سے

واقف ہونے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم میں فقہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

یہاں دین کے علم کو حاصل کرنے کو تفقہ کہا گیا ہے۔

اسی طرح امام جعفر صادقؑ نے فرمایا :

"کاش میرے اصحاب کے سروں پر علم فقہ حاصل کرنے کے لئے لاٹھیاں برسائی جائیں"۔

اور فرمایا:

"دین میں تفقہ حاصل کرو، علم دین کو سیکھو، علم دین حاصل کرو۔ بتحقیق جو شخص علم دین حاصل نہیں کرتا وہ دیہاتی اور نادان ہے۔"

امیرالمومنینؑ نے فرمایا۔

"لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں۔ عالم، متعلم اور گھاس پھوس۔"

اس حدیث کا ترجمہ کرتے ہوئے ہمیں شرم آتی ہے۔ کیونکہ امامؑ اسکے بعد فرماتے ہیں کہ ہم عالم ہیں اور ہمارے شیعہ متعلم، باقی لوگ گھاس پھوس ہیں۔ اس لئے شیعوں کا خصوصی امتیاز یہ ہے کہ وہ دینی علم کے متعلم کی حیثیت رکھتے ہیں ورنہ ان کا شمار گھاس پھوس میں ہوگا، شیعوں میں نہیں۔

امام جعفر صادقؑ کا فرمان ہے کہ: "اگر ہمارے پاس ہمارے شیعہ نوجوانوں میں سے کوئی جوان حاضر کیا جائے اور وہ تفقہ نہ کرتا ہو تو میں اس کو سزا دوں گا"۔

یہاں میں عشق و محبت سے سرشار شیعہ نوجوانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ امام جعفر صادقؑ کی تادیب سے پہلے اپنے آپ کو متعلم مذہب بنائیں۔

یہاں تک فقہ کے معنی علم دین حاصل کرنے کے بتائے گئے ہیں۔

امام محمد باقرؑ نے فقیہ کی حیثیت اور حقیقی مصداق کی توضیح فرمائی ہے اور تنہا علم حاصل کرنے والوں سے فقیہ کا لقب چھین لیا ہے۔ کسی نے امام محمد باقرؑ سے کوئی سوال پوچھا تو امامؑ نے اس کا جواب دیا۔ سائل نے عرض کیا کہ فقہاء تو یہ

نہیں کہتے۔ امامؑ نے فرمایا افسوس ہو تم پر کیا تم نے کبھی فقیہ کو دیکھا ہے۔ فقیہ اور حق فقاہت رکھنے والے وہ ہیں جو دنیا میں زہد کرتے ہیں' آخرت کی طرف رغبت رکھتے ہیں اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سے متصل ہیں۔

ان احادیث میں چونکہ علم دین اور تفقہ فی الدین کا ذکر آیا ہے لہٰذا بہتر ہو گا کہ ہم آپ کے سامنے علم دین اور تفقہ فی الدین کی حدود واضح کردیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ علم دین کسے کہتے ہیں۔

امام موسیٰ کاظمؑ سے مروی ہے کہ :

ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم مسجد میں داخل ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ لوگوں نے کسی شخص کو گھیرے میں لے رکھا ہے' وہ اس کی طرف متوجہ ہیں اور غور سے اس کی باتوں کو سن رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم یہ علامہ ہیں۔ فرمایا علامہ کیا ہوتا ہے اور علامہ کسے کہتے ہیں؟ جواب ملا علامہ سب سے زیادہ انساب عرب کو جاننے والے کو کہتے ہیں' ایسے شخص کو کہتے ہیں جو ان کے واقعات اور تاریخ جاہلیت سے واقفیت رکھتا ہے اور عربی اشعار جانتا ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا "یہ وہ علم ہے اگر کوئی نہ جانے تو نقصان نہیں اور اگر جانے تو کوئی فائدہ نہیں ہے"۔

بہ تحقیق علم تین قسم کے ہیں آیت محکمہ' سنت قائمہ اور فریضہ واجبہ یعنی اعتقادات' واجبات اور اخلاقیات۔ باقی جتنے علم ہیں وہ فاضل ہیں' جاننا نہ جاننے سے بہتر ہے' لیکن مقدم یہ تین علم ہیں۔ دوسری حدیث میں راوی کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو یہ کہتے سنا کہ میں نے تمام لوگوں کے لئے ضروری اور اہمیت والے علم کو چار علوم میں پایا۔ پہلا یہ کہ وہ اپنے رب کو جان لیں اور اپنے رب کی پہچان کریں۔ دوسرے یہ کہ اسے اللہ نے کن چیزوں سے نوازا ہے اور کیا بخشا ہے؟ تیسرے یہ کہ اس نے کیا طلب کیا اور کیا مانگا ہے؟

چوتھے کون سی چیز اسے دین سے خارج کرتی ہے؟

ہمارے نوجوانوں کو ان دو احادیث کی روشنی میں رہ کر اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہئے اور اپنے اوقات کو ان ہی چار علوم میں صرف کرنا چاہئے۔ یہاں یہ واضح ہوا کہ فقہ کے معنی جاننے کے ہیں جو علم و فہم کے معنی رکھتا ہے۔

ان احادیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ سمجھ دار اور شریعت الٰہی سے واقف حضرات فقیہ کہلاتے ہیں۔ اس طرح یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ ولی مسلمین فقیہ ہی ہوگا نہ کہ نادان اور کم علم شخص۔

ولایت کی اہمیت

جیسا کہ ولایت کی بحث سے ثابت ہوا کہ حکومت صرف اللہ کا حق ہے اور خدا کے بعد وہی شخص اس کو چلانے کا حق دار ہے جو خدا کی طرف سے منسوب ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس حکومت کو چلانے کے لئے سلسلہ انبیاء آدمؑ سے محمد مصطفٰیؐ تک قائم کیا۔ خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جب دنیا سے رخصت ہونے لگے تو فرمایا ! کیا میں تمہاری جان و مال پر سب سے زیادہ تصرف نہیں رکھتا ہوں۔ تو امت نے بیک وقت ایک آواز سے اس کی تصدیق کی۔ اولیٰ بالتصرف کی تصدیق ہوتے ہی حضرت علی علیہ السلام کو محمد مصطفٰیؐ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنا ولی مقرر کیا۔ اعلان ولایت علیؑ کے ساتھ ہی آیت شریف نازل ہوئی۔

"آج کے دن کفار تمہارے دین سے مایوس ہو گئے ہیں۔ اب ان سے نہ ڈرو تنہا میری ذات سے ڈرو۔ کیونکہ آج میں نے تمہارے دین کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے اور تمہارے لئے اسلام کو پسند کیا ہے۔"

جس دن سے دین اسلام کی قیادت شکل رسالت سے ولایت میں منتقل ہوئی کفار کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ چونکہ تنہا قانون کام نہیں کرتا، قانون چلانے

کے لئے مجری قانون کے ساتھ ساتھ محافظ قانون کی بھی ضرورت ہوتی ہے' لہٰذا مشرکین قیادت کے فقدان کا انتظار کر رہے تھے۔ اگر قیادت شخصی ہوتی (یعنی ایک شخص سے دوسرے شخص کو منتقل ہوتی) تو ان کی امیدیں باقی رہتیں کہ مزید دس بیس سال کے انتظار کے بعد کامیاب ہو جائیں گے جس کے لئے وہ بالکل تیار تھے۔ مگر جوں ہی قیادت شکل رسالت سے شکل ولایت میں داخل ہوئی' ان کی تمام امیدیں ختم ہو گئیں۔ یہاں یہ بات واضح ہوئی کہ کفار ولایت کے صحیح معنی سمجھتے تھے کہ یہ درحقیقت ان کے ناپاک عزائم کی بیخ کنی ہے لیکن ہم صحیح معنوں میں نہ سمجھ سکے۔ بہرحال قیادت رسالت سے ولایت کی شکل میں سامنے آئی۔

ولایت حقیقی

اس کے ذمہ دو کام تھے اور جب تک طاقت و قدرت تھی دونوں کاموں کو انجام دیا۔ یعنی اول اجراء قانون اور دوم حفظ قانون۔ تنہا قانون کے رہنے میں کوئی فائدہ نہیں اور قانون کو کسی کرہ میں بغیر امام معصوم بھی محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا قانون تنہا کوئی حیثیت نہیں رکھتا جب تک کہ وہ عمل و اجراء میں نہ لایا جائے۔ قانون خواہ انسان کا بنایا ہوا ہو یا الٰہی قانون ہو' جان و مال و ناموس و حقوق کی حفاظ کے لئے بنایا جاتا ہے۔ جب ائمہ کو اجراء قانون کے منصب سے ہٹایا گیا تو وہ حفاظت قانون کرتے رہے اور ساتھ ساتھ منصب اجراء قانون کو پھر سے واپس لانے کی سعی بھی جاری رکھی۔ برخلاف ہماری سوچ کے کہ وہ گوشہ نشین تھے اور معاشرہ سے الگ تھلگ رہ کر عبادت اور دعا میں مصروف رہتے تھے۔ اس عمل میں بھلا ان کی کیا فضیلت اور امت پر کیا فوقیت ہو سکتی ہے؟ جب کہ دنیا میں ہزاروں کی تعداد میں زاہد و پارسا اور ترک لذت [illegible] ہیں۔ ان کی تو ہم ستائش نہیں کرتے بلکہ درحقیقت اسلام ان [illegible]

ہے۔

کسی شخص کا کسی قوم پر اس وقت دعویٰ اور حق ہوتا ہے کہ جب وہ شخص اس کے لئے کچھ کرے۔ پس ساری زندگی ہمارے ائمہؑ نے لوگوں کی جان ومال وناموس کی حفاظت میں صرف کی اور ہمارے دکھ میں شریک رہے۔ جب ہمارے گیارہ امامؑ جو منصوص من اللہ تھے اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور امام آخرالزماںؑ پردۂ غیبت میں چلے گئے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دور غیبت کے لئے امام زمانہؑ یا دوسرے ائمہ یا خود رسول اللہؐ نے جو یقیناً ان حالات سے واقف تھے، امت کے لئے کوئی لائحہ عمل پیش کیا یا پھر سب ہی کچھ امت پر چھوڑ کر چلے گئے۔ یقیناً آپ دوسرے تصور کو مسترد کریں گے کیونکہ یہ عقل اور اصول شرع کے منافی ہے کہ ائمہ معصومینؑ بغیر کسی مجری قانون اور محافظ قانون کے انتظام کے اس دنیا سے رخصت ہوں۔ لہٰذا اس دور غیبت میں عہدہ ولایت کو سنبھالنے کا ارفع واولیٰ حق فقیہ اور مجتہد کو دیا گیا ہے اور امت کو ان فقہا اور مجتہدین کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا۔

ولایت فقیہ احادیث کی روشنی میں

حدیث نمبر۱ :

"جب کوئی ایسا شخص کسی قوم کا قائد ہو جبکہ اس قوم میں اس سے زیادہ علم رکھنے والا فقیہ موجود ہو تو یہ قوم ہمیشہ زوال اور نابودی و بربادی کی طرف رواں دواں رہے گی اور قیامت تک سدھر نہ سکے گی"۔

حدیث نمبر۲ :

"جب کوئی قوم کسی ایسے شخص کو حاکم اور ولی بنائے جس سے زیادہ عالم اور فقیہ شخص موجود ہو تو یہ قوم نابود و زوال پذیر ہوگی"۔

حدیث نمبر۳ :

"ریاست و حکومت کا اہل صرف وہ شخص ہے جو اس کو چلانے کی صلاحیت اور اہلیت رکھتا ہو۔ اگر کوئی شخص قوم کو اپنی طرف دعوت دے جب کہ اس کی قوم میں اس سے زیادہ صلاحیت رکھنے والا موجود ہو تو خدا اس پر قیامت تک نظر نہیں کرے گا"۔

حدیث نمبر۴ :

حضرت علیؑ نے فرمایا کہ "سب سے زیادہ منصب ولایت کا حقدار وہ ہے جو سب سے زیادہ عالم اور فقیہ ہو اور سب سے زیادہ طاقت اور قدرت کا حامل ہو"۔

حدیث نمبر۵ :

"امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ فقط وہی شخص منصب امامت کی صلاحیت کا حامل ہے جس میں تین خصلتیں ہوں (۱) ورع ہو جس کے سبب وہ خود کو گناہوں سے محفوظ رکھ سکے۔ (۲) حلم ہو جس کے ذریعے وہ اپنے غضب کو روک سکے۔ (۳) اپنی رعیت سے ایسا حسن سلوک رکھتا ہو جیسا مہربان باپ اپنے بیٹے سے سلوک کرتا ہے"۔

ان تمام روایات سے جو کہ ائمہ معصومینؑ سے مروی ہیں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ملت کی قیادت کا سب سے زیادہ حقدار، شریعت الٰہی سے واقفیت رکھنے والا شخص ہوگا۔

ولی فقیہ کا انتخاب

ولی فقیہ کا انتخاب اور پہچان انہی طریقوں سے ہوگی کہ جو مرجع تقلید کے انتخاب میں مروج ہے۔ یعنی ولی فقیہ کے انتخاب یا پہچان کے تین طریقے ہیں۔

(۱) ۔ اول یہ کہ خود باخبر ہونا جس کے لئے علمی صلاحیت اور قریبی پہچان کی

ضرورت ہے۔

(۲) - دوئم یہ کہ دو عادل اشخاص کا بتانا۔

(۳) - سوئم یہ کہ وہ فقیہ شہرہ آفاق ہو۔

البتہ ولی فقیہ اور مرجع تقلید کے انتخاب میں کچھ فرق ملحوظ رکھنا پڑتا ہے اور وہ یہ ہے۔

مرجع تقلید کے طریقہ انتخاب میں کچھ بد نظمی موجود ہے جو کہ ولی فقیہ کے انتخاب میں موجود نہیں ہوگی۔ چونکہ مرجع تقلید کا کام فتویٰ دینا ہے' لہٰذا تعداد مراجع مخصوص نہیں اور کم اور زیادہ ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن چونکہ ولی فقیہ کا تعلق ریاست عامہ مسلمین سے ہے' لہٰذا یہاں کثرت تعداد بد نظمی کا موجب ہوگی۔ اس لئے ریاست عامہ مسلمین میں جہاں تک ممکن ہو ایک ہی ولی کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ایک ولی فقیہ پر اتفاق نہ ہو تو کوشش یہ ہوگی کہ ولی فقیہ کی کم سے کم تعداد پر اتفاق ہو جو ایک شورائے رہبریت میں شامل ہوں گے اور باہم صلاح و مشورے اور اتفاق رائے سے کار ولایت فقیہ کو انجام دیں گے۔ مرجع تقلید کی شرائط میں سیاست و تدبر مملکت کو نظر انداز کیا جاتا ہے لیکن ولی فقیہ کے لئے سیاست انتہائی اہمیت کی حامل ہوگی۔ امت مسلمہ اس ضرورت کا احساس ہونے پر پہلے ملک کے جید علماء کا انتخاب کرے گی اور یہی علماء بعد میں ولی فقیہ کا تعین کریں گے۔

علماء و فقہاء کی پہچان احادیث کی روشنی میں

(۱) - میری امت میں دو گروہ ایسے ہیں کہ اگر وہ صالح ہوں گے تو امت صالح ہوگی اور اگر وہ فاسد ہوں گے تو امت بھی فاسد ہوگی۔ یہ دو گروہ' علماء اور حکام ہیں۔ (نبی کریمؐ)

(۲) - ظلم و جور پر خاموش رہنے والے علماء پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ (نبی

کریمؐ)

(۳) ۔ اگر کوئی جابر بادشاہ حلال کو حرام کرے اور حرام کو حلال کرے اور اللہ کے بندوں پر ظلم کرے اور عالم اپنی زبان اور اپنے ہاتھ سے اس کا خاتمہ نہ کرے تو اس عالم پر اللہ کی لعنت ہو گی۔(نبی کریمؐ)

(۴) ۔ ظالم کے ظلم اور مظلوم کی بھوک پر علماء کو صبر نہیں آنا چاہئے۔(حضرت علیؑ)

(۵) ۔ علماء و فقہاء جب ظالم و جابر بادشاہ سے بے تعلقی اختیار کریں گے تو حجت خدا ہو گی۔(نبی کریمؐ)

(۶) ۔ علماء و فقہاء انبیاءؑ کے جانشین ہیں۔(نبی کریمؐ)

(۷) ۔ علماء لوگوں پر حاکم ہیں۔(امام علیؑ)

(۸) ۔ تمہارے امور و احکام علماء باللہ کے ہاتھوں میں ہیں۔(حضرت امام حسینؑ)

(۹) ۔ جو فقیہ اپنے نفس کو بچائے' اپنے دین کی حفاظت کرے اور خواہشات نفسانی کی مخالفت کرے' ایسے فقیہ کی طرف رجوع کرو۔(امام حسن عسکریؑ)

(۱۰) ۔ جو حالات و حوادث ہماری غیبت کے دوران پیدا ہوں گے' اس میں ہماری احادیث کی صحیح روایت کرنے والے کی طرف رجوع کرو۔(امام زمانہؑ)

مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں

ولی فقیہ وہ ہو گا:۔

☆ جو سب سے زیادہ عادل ہو۔

☆ جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

☆ جو سب سے زیادہ خواہشات نفسانی کی مخالفت کرے۔

☆ جو سب سے زیادہ طاقت و قدرت کا مالک ہو۔

☆ جو سب سے زیادہ ظلم کے مقابل میں آواز اٹھانے والا ہو۔

☆ جو بدعتوں کے رواج پر صبر نہ کرتا ہو۔

☆ جو بندگان خدا کی حق تلفی اور حقوق کی پامالی پر خاموش نہ رہتا ہو۔

☆ جو لوگوں پر سب سے زیادہ مہربان ہو۔

ظہور مہدیؑ اور

حکومتِ مستضعفین

قرآن کریم کی بہت سی آیات' کتب آسمانی اور انبیائے سابقین کی بشارتیں' ائمہ طاہرین کی روایات اور پیش گوئیاں اور اقوام عالم کی آرزوئیں' سب اس بات پر متفق ہیں کہ مستقبل کا انسان ایک ایسے درخشاں اور تابناک دور میں زندگی بسر کرے گا جس میں ظلم صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا' عدل و انصاف کا دور دورہ ہو گا اور تمام برائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

یہ وہ وقت ہو گا جب ساری دنیا میں پرچم توحید لہرایا جائے گا۔ استکبار اور غیر خدا کی بندگی ختم ہو جائے گی اور ساری دنیا کی حکومت مستضعفین کے ہاتھوں میں ہوگی۔ مستضعفین کی اس حکومت کی قیادت امام زمانہ عجل اللہ فرجہ شریف فرمائینگے۔

اس امام مستضعفین کی ولادت باسعادت کے موقع پر ہم تمام مستضعفین عالم کو ہدیہ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی ظالمین و مستکبرین عالم کو متنبہ اور خبردار کرتے ہیں کہ وہ مستضعفین کی عدالت میں پیش ہونے سے پہلے توبہ واستغفار کرلیں اور استکبار کو چھوڑ دیں ورنہ دردناک عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس موقع پر ہم مستضعفین عالم سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنے آقا اور

مولا، قائد مستضعفین کے ظہور کے لئے ماحول کو سازگار بنائیں، اس عظیم جشن کی تیاریاں شروع کریں اور اس میں حائل رکاوٹوں کو دور کریں۔

امام مستضعفین کی ولادت کے اس موقع پر مناسب ہو گا کہ ہم ان مستضعفین کی تشخیص کریں جن کے بارے میں بشارت دی گئی ہے کہ وہ امام زمانہؑ کے ظہور کے بعد حکومت کریں گے کیونکہ تمام مستضعفین جہاں لائق مدح وستائش نہیں، صرف ایک خاص صنف اور نوع کو یہ بشارت دی گئی ہے۔

مستضعف:

لفظ مستضعف، ضعف سے بنا ہے۔ "ضعف" کے معنی کمزوری و ناتوانی کے ہیں جبکہ مستضعف کے معنی "ضعیف بنایا ہوا" یا "کمزور بنایا ہوا" ہیں۔

مستضعف تنہا اقتصادی لحاظ سے کمزور نہیں ہوتا (جیسا کہ مارکسٹ مفکرین اپنے نظریات کو ثابت کرنے کیلئے قرآنی آیات کی اقتصادی تفسیر کر کے مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں) بلکہ اسے تمام معنوں اور حیثیتوں یعنی فکر، سوچ، سیاسی آزادی اور حقوق، غرض کہ ہر لحاظ سے ضعیف اور کمزور بنایا جاتا ہے۔

مستضعف کی اقسام:

مستضعفین دو قسم کے ہوتے ہیں

۱ ۔ مستضعف جاہل و ناداں ۲ ۔ مستضعف عالم و دانا

مستضعف جاہل و ناداں

یہ وہ مستضعفین ہیں جو اپنی جہالت اور نادانی کے سبب ضعیف و کمزور ہیں۔ خداوند تعالی سورہ نساء میں ان کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

"ہاں جو مرد عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے۔ اور اللہ بڑا

معاف کردینے والا اور درگذر کرنے والا ہے۔"

(سورہ النساء ۴۔ آیت ۹۸)

ان مستضعفین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں:

"مستضعف وہ ہے کہ جو نہ تو ہدایت حاصل کرسکے تاکہ مومن ہوجائے اور نہ ہی کفر اختیار کرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عقل و شعور نہیں رکھتے۔"

جاہل و ناداں مستضعف بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔

(۱) ایک وہ طبقہ جو واقعا عاجز و ناداں ہے اور فطری صلاحیتوں کے فقدان کی وجہ سے علم و آگاہی حاصل کرنے سے قاصر ہے۔ خدا ایسے لوگوں کو عفو و درگزر کرے گا۔ چنانچہ سورہ نساء ہی کی اگلی آیتوں میں ان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"مگر جو مرد اور عورتیں اور بچے اس قدر مستضعف ہیں کہ نہ تو (دارالحرب سے نکلنے کی) کوئی تدبیر کرسکتے ہیں' نہ ان کو اپنی رہائی کی کوئی راہ دکھائی دیتی ہے تو امید ہے کہ خدا ایسے لوگوں سے درگذر کرے اور خدا بڑا معاف کرنے والا' بخشنے والا ہے۔"

(سورہ نساء ۴۔ آیات ۹۹۔ ۹۸)

(۲) دوسرا وہ طبقہ جو علم و آگاہی حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن جاہل ہے۔ معاشرے کیلئے یہ گروہ سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ جب تک معاشرے کے اس طبقہ کا خاتمہ نہیں کیا جائے گا معاشرہ خطرے میں رہے گا۔

مستضعف عالم و دانا

مستضعف عالم و دانا بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔

(۱) مستضعف ظالم و متکبر (۲) مستضعف متقی و پرہیزگار

مستضعف ظالم

مستضعف ظالم کی بھی مختلف قسمیں ہیں:۔

۱ ۔ وہ گروہ جو حقیقی مستکبر اور حقیقی ظالم کے آلہ کار بن کر یعنی ان کے اشاروں پر چل کر ظلم کرتے ہیں۔ یہ لوگ انہی ظالموں کا نمک کھاتے اور ان کے تمام ظلم میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔ یہ لوگ انہی ظالموں کے ساتھ محشور ہونگے جیسا کہ سورہ سبا میں ارشاد ہوتا ہے:

"اور (اے رسول تم کو بہت تعجب ہوگا) اگر تم دیکھو کہ جب یہ ظالم (قیامت کے دن) اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے تو ان میں کا ایک دوسرے کی طرف (اپنی) بات کو پھیرتا ہوگا۔ مستضعف لوگ مستکبر لوگوں سے کہیں گے کہ اگر تم ہمیں نہ (بہکاتے) ہوتے ہم ضرور ایماندار ہوتے (اور اس مصیبت میں نہ پڑتے)۔ تو مستکبر لوگ مستضعفین سے کہیں گے کہ جب تمہارے پاس ہدایت آئی تھی تو کیا اس کے آنے کے بعد ہم نے تم کو (زبردستی عمل کرنے سے) روکا تھا (ہرگز نہیں) بلکہ تم تو خود مجرم تھے۔"

(سورہ سباء ۳۴۔ آیات ۳۲/۳۱)

(۲) وہ گروہ جس کی حقیقتاً کوئی مقام و حیثیت نہیں ہے لیکن وہ چاہتے ہیں کہ ظالموں کے دربار میں رہ کر مقام و منزلت حاصل کریں۔ یہ لوگ ظالموں کو ظلم کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ وہ ان سے راضی رہیں جیسا کہ سورہ اعراف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور فرعون کی قوم کے چند سرداروں نے (فرعون سے) کہا کہ کیا آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو (انکی حالت پر) چھوڑ دیں گے کہ ملک میں فساد کرتے پھریں اور آپ کو اور آپ کے خداؤں (کی پرستش) کو چھوڑ

بیٹھیں ' فرعون کہنے لگا (تم گھبراؤ نہیں) ہم عنقریب ہی ان کے بیٹوں کو
قتل کرتے ہیں اور انکی عورتوں کو (لونڈیاں بنا کر) زندہ رکھتے ہیں اور ہم
تو ہر طرح ان پر قابو رکھتے ہیں۔"

(سورہ اعراف ۷۔ آیت ۱۲۷)

(۳) وہ گروہ جو ان پڑھ ہے۔ ان لوگوں کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں عالم' متعلم اور گھاس پھوس۔"

یہاں گھاس پھوس سے مراد انسانوں کا یہی گروہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہوا کا رخ دیکھ کر چلتے ہیں' اس لئے اس ظلم کو پہنچانتے اور سمجھتے ہی نہیں جو معاشرے میں ہو رہا ہوتا ہے۔ قیامت کے روز جب ان سے پوچھا جائیگا کہ جب تمہارے اپنے معاشرے میں ظلم ہو رہا تھا تم خاموش کیوں بیٹھے رہے' تو یہ لوگ جواب دیں گے کہ ہم نے اپنے بزرگوں کی اطاعت و فرمانبرداری کی تو ہم گمراہ ہوئے۔ چنانچہ سورہ احزاب میں خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"جس دن ان کے منہ جہنم میں الٹے پلٹے جائیں گے تو کہیں گے اے
کاش ہم نے خدا کی اطاعت کی ہوتی اور رسول کا کہا مانا ہوتا اور کہیں
گے کہ پروردگارا ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کا کہا مانا انہوں
نے ہی ہمیں گمراہ کردیا۔"

(سورہ احزاب ۳۳۔ آیات ۶۷/۶۶)

(۴) وہ گروہ جو ظلم کو سمجھتا ہے جانتا ہے لیکن پھر بھی خاموش رہتا ہے۔ اسکی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح ظالم کے ساتھ صلح کرلیں۔ یہ پہلے اور دوسرے گروہ کے ظالمین جیسے نہیں ہیں کیونکہ وہ خود کوئی ظلم نہیں کرتے اور نہ ہی انکا تعلق ظالمین کے تیسرے گروہ سے ہے کیونکہ وہ ظلم کا انکار نہیں کرتے بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو خود اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں۔ ان سے کسی قسم کی توقع

نہیں کی جا سکتی۔ ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد رب العزت ہے:

"بے شک جن لوگوں کی روح فرشتوں نے اس وقت قبض کی (جب وہ دار الحرب میں پڑے) اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے (تو فرشتے روح قبض کرنے کے بعد حیرت سے) کہتے کہ تم کس حالت (غفلت) میں تھے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو روئے زمین میں مستضعف تھے تو فرشتے کہتے ہیں کہ خدا کی زمین میں اتنی بھی گنجائش نہ تھی کہ تم (کہیں) ہجرت کر کے چلے جاتے۔ پس ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانہ ہے"۔

(سورہ النساء ۴۔ آیت ۹۷)

(دار الحرب یعنی وہ مقام جہاں جنگ ہو رہی ہو)

(۵) وہ گروہ جو ظلم کو جانتا اور سمجھتا ہے لیکن نہ تو ظالم کے ساتھ صلح کرتا ہے اور نہ ہی ظلم کے خاتمہ کیلئے کوشش کرتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو میدان ہی سے ہٹ جاتے ہیں اور گوشہ نشینی اور رہبانیت اختیار کر کے اپنے کو معاشرے سے الگ تھلگ کر لیتے ہیں۔ اسلام ایسے لوگوں کی شدید لہجے میں مذمت کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ حدید میں ارشاد ہوتا ہے۔

"پھر ہم نے انہیں (نوح اور ابراہیم) کے نقش قدم پر دوسرے رسول بھیجے اور ان کے پیچھے عیسی بن مریم کو بھیجا اور انہیں انجیل عطا کر دی اور ان کا اتباع کرنے والوں کے دلوں میں مہربانی اور محبت قرار دے دی اور جس رہبانیت کو ان لوگوں نے از خود ایجاد کر لیا تھا اور اس سے رضائے خدا کے طلبگار تھے اسے ہم نے ان کے اوپر فرض نہیں قرار دیا تھا اور انہوں نے خود بھی اس کی مکمل پاسداری نہیں کی تو ہم نے ان میں سے واقعا ایمان لانے والوں کو اجر عطا کر دیا اور ان میں سے بہت سے تو بالکل فاسق اور بدکردار تھے"۔

(سورۂ حدید ۵۷۔ آیت ۲۷)

متقی و پرہیزگار مستضعف

مستضعفین کا یہ گروہ وہ گروہ ہے جو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کے بعد ظالم سے مقابلہ کرنے کا عزم و ارادہ کرلیتا ہے۔ لہٰذا ظالم کے ظلم اور تشدد کا نشانہ بھی یہی گروہ بنتا ہے۔ صرف یہی وہ گروہ ہے جس سے خیر کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔ اس گروہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے خداوند تعالیٰ سورہ بقرہ میں ارشاد فرماتا ہے

"اور (اس وقت کو یاد کرو) جب ہم نے تمہیں (تمہارے بزرگوں کو) قوم فرعون (کے پنجہ) سے چھڑایا جو تمہیں بڑے بڑے دکھ دیکر ستاتے تھے' تمہارے لڑکوں پر چھری پھیرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو (اپنی خدمت کیلئے) زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے سخت آزمائش تھی۔"

(سورہ بقرہ۲۔ آیت۴۹)

یہی گروہ مستضعفین کا وہ گروہ ہے جس کیلئے قرآن کریم نے آخری زمانے میں حکومت کرنے کی بشارت دی ہے۔

مستضعف بنانے کے طریقے

ظالمین اور مستکبرین خدا کے بندوں کو مستضعف بنانے کے لئے جو مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱ - باطل نظریات کی تبلیغ کے ذریعے' بندگان خدا کے درمیان تفرقہ اندازی اور گروہ بندی پیدا کرتے ہیں جس سے ان کا آپس کا اتحاد و اتفاق پارہ پارہ ہوجاتا ہے۔ وہ آپس ہی کے جھگڑوں میں ساری طاقت ضائع کردیتے ہیں اور یوں کمزور ہوجاتے ہیں۔ سورہ قصص میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

"بے شک فرعون نے (مصر کی) سرزمین میں بہت سر اٹھایا! اور اس نے

وہاں کے رہنے والوں کو کئی گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو مستضعف کر دیا تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرا دیتا تھا اور ان کی عورتوں (بیٹیوں) کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ بے شک وہ بھی مفسدوں میں سے تھا۔"

(سورہ قصص ۲۸۔ آیت ۴)

۲ ۔ عزت وذلت کے اصل معیار کو تبدیل کر کے بندگان خدا کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور انکی توہین کرتے ہیں۔ یوں دنیا کی نظروں میں انھیں ذلیل کرا کے کمزور بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ سورہ زخرف میں ارشاد ہوتا ہے:

"اور فرعون نے اپنے لوگوں میں پکار کر کہا' اے میری قوم کیا یہ ملک مصر میرا نہیں اور کیا یہ نہریں جو میرے قدموں کے نیچے بہہ رہی ہیں یہ سب میری نہیں ہیں' تو کیا تم کو اتنا بھی نہیں سوجھتا کیا میں اس شخص سے بہتر نہیں ہوں جو پست حیثیت کا آدمی ہے اور صاف گفتگو بھی نہیں کر سکتا پھر کیوں اس کیلئے (خدا کے یہاں سے) سونے کے کنگھن نہیں اتارے گئے اور کیوں اسکے ساتھ ملائکہ جمع ہو کر نہیں آئے۔ غرض فرعون نے (باتیں بنا کر) اپنی قوم کی عقل ماردی اور وہ لوگ اس کے تابع دار بن گئے۔ بے شک وہ لوگ بدکار تھے۔"

(سورہ زخرف ۴۳۔ آیات ۵۱ تا ۵۴)

۳ ۔ اپنی طاقت کا زور دکھا کر مختلف قسم کی دھمکیوں کے ذریعہ بندگان خدا سے مقابلہ کرنے کی حس کو چھین لیتے ہیں اور یوں انھیں کمزور بنا دیتے ہیں۔ جیسا کہ سورہ اعراف میں خداوند تعالیٰ ذکر کرتا ہے کہ جب جادوگروں نے موسیٰ کا معجزہ دیکھا تو وہ سب کے سب سجدہ میں گر پڑے اور بولے کہ ہم سارے جہاں کے پروردگار پر ایمان لائے۔ اس پر فرعون کہنے لگا:

"فرعون نے کہا کہ تم میری اجازت سے پہلے کیسے ایمان لے آئے یہ

ضرور تم لوگوں کی مکاری ہے جو تم لوگوں نے اس شہر میں پھیلا رکھی ہے تاکہ اس کے باشندوں کو یہاں سے نکال باہر کرو۔ پس تمہیں عنقریب ہی (اپنی) اس شرارت کا مزا معلوم ہو جائیگا۔ یوں تو یقیناً تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کٹوا ڈالوں گا پھر تم سب کے سب کو سولی دے دوں گا۔"

(سورہ اعراف ۷۔ آیات ۱۲۳/۱۲۴)

مستضعف بنانے کے لیئے سازگار ماحول

مستکبرین اگر ماحول سازگار پائیں' تو ان کیلئے کسی قوم کو ضعیف اور کمزور بنانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

(۱) جہاں خواہشات نفسانی اور شہوات حیوانی کی پیروی کا رجحان زیادہ ہو' وہاں انسان کو بڑی آسانی کے ساتھ مستضعف بنایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جہاں بھی مستکبرین ایسا ماحول پاتے ہیں وہ لوگوں کی نفسیاتی خواہشات کو بڑھانے اور انہیں جلا دینے کا زیادہ سے زیادہ سامان فراہم کرتے ہیں۔ وہ طرح طرح کی برائیوں کو رواج دیتے ہیں۔ شراب' جوئے کو فروغ دیتے ہیں' زنا کے وسائل مثلاً سینما گھروں' بے حیا فلموں' فحش کہانیوں وغیرہ کو پھیلاتے ہیں' غنا اور رقاصی کی محفلیں جماتے ہیں' مال و دولت کی لالچ دیتے ہیں' رشوت خوری کا بازار گرم کرتے ہیں اور اقتدار و ریاست' مقام و منزلت کی طمع دیتے ہیں۔

لہٰذا جو شخص ظلم اور استکبار کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ وہ اپنی نفسانی خواہشات پر قابو کرے اور خود کو ان کی پیروی میں شرعی حدود سے تجاوز سے بچا کر رکھے۔

(۲) جس قوم میں صحیح اور صالح قیادت کا فقدان ہو' اسے بڑی آسانی سے مستضعف بنایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا مستکبرین ہمیشہ اس کوشش میں ہوتے ہیں کہ کسی بھی صورت میں کسی ایک شخص پر قوم کا اتفاق نہ ہونے دیں۔ انکی یہ کوشش

ہوتی ہے کہ اقتدار بٹتا اور تقسیم ہوتا رہے تاکہ وہ زیادہ لوگوں میں اقتدار کی لالچ اور ہوس پیدا کر سکیں۔

(۳) وہ صالح قیادت کی صحیح صلاحیتوں اور شرائط کو بدل کر غلط صلاحیتوں اور شرائط کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اگر کبھی صحیح قیادت مل بھی جائے تو وہ اس پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں اور اس قیادت کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لہٰذا جب بھی کوئی قوم مظالم کا شکار ہو تو اسے چاہئے کہ خدا سے صالح قیادت عطا کرنے کی دعا کرے۔ جیسا کہ خداوند تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے:

"تم کو کیا ہو گیا ہے کہ خدا کی راہ میں ان مستضعف مردوں اور عورتوں اور بچوں (کو کفار کے پنجہ سے چھڑانے) کیلئے جہاد نہیں کرتے جو خدا سے دعا مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے پالنے والے کسی طرح اس بستی سے جس کے باشندے بڑے ظالم ہیں، ہمیں نکال اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا قائد بنا اور تو خود ہی کسی کو اپنی طرف سے ہمارا مددگار بنا۔"

(سورہ نساء ۴۔ آیت ۷۵)

سرداران بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا:

"ہمارے لیئے ایک بادشاہ مقرر کردو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ نبی نے پوچھا کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے اور تم نہ لڑو۔ وہ کہنے لگے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہ خدا میں نہ لڑیں جبکہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور ہمارے بال بچے ہم سے جدا کر دیئے گئے ہیں۔"

(سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۲۴۶)

ان تمام باتوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ تاریخ اسلام اور سیرت

انبیاءؑ و ائمہؑ کا بغور مطالعہ کیا جائے کیونکہ اسی میں ہمارے لئے اسوہ ہے۔

رمضان کی مشہور دعا "دعائے افتتاح" میں ہم پڑھتے ہیں:

"پالنے والے ہم تجھ سے ایسی حکومت کی درخواست کرتے ہیں جس کے سایہ میں اسلام اور مسلمانوں کو عزت ملے، منافقین و کفار اور ان کے حامیوں کی ذلت ہو اور ہمیں اس حکومت میں اپنی طرف سے حکومت کرنے والوں اور قیادت کرنے والوں میں قرار دے۔"

(آمین و ثم آمین)

مصادرِ حقوق

انسانی حقوق کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جو انسانی سماج کے ابتدائی دور ہی سے زیر بحث رہے ہیں۔ جوں جوں بشریت نے اپنی منزلیں طے کیں اور انسانی معاشروں نے وسعت اختیار کی یہ مسئلہ بھی اہم تر ہوتا گیا ہے۔

زیر نظر مقالے میں ہمارا مقصد حقوق انسانی کی قدر و قیمت اور اہمیت بتانا نہیں اور نہ ہی انسانی حقوق کے بارے میں مختلف مکاتب فکر کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کا بیان مقصود ہے بلکہ جیسا ہمارے مقالے کے عنوان سے ظاہر ہے ہم محض انسانی حقوق کے حقیقی مصدر کی جانب اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ انسانی حقوق معین کرنے کی سزاوار کون سی اتھارٹی ہے اور کون حقوق انسانی وضع کرنے کا اہل و مجاز ہے۔

اس وقت عالمی سطح پر حقوق انسانی کے لئے سرگرم عمل سب سے بڑا ادارہ "انجمن اقوام متحدہ" (UNO) ہے اور اسی کے متعین کئے ہوئے انسانی حقوق کے چارٹر کے تحفظ کے لئے دنیا بھر میں بے شمار چھوٹی بڑی تنظیمیں مصروف کار ہیں۔ لہٰذا ہم بہ آسانی کہہ سکتے ہیں کہ آج دنیا میں جن انسانی حقوق کے تحفظ کے نعرے لگائے جا رہے ہیں وہ انجمن اقوام متحدہ کے معین و مقرر کردہ حقوق ہیں۔

انہی حقوق کی پامالی کو بنیاد بنا کر حکومتیں تبدیل کی جاتی ہیں ' من پسند تحریکوں کو امداد فراہم کی جاتی ہے ' بین الاقوامی عدالتیں قائم کی جاتی ہیں ' فوجی کاروائیاں عمل میں آتی ہیں اور عالمی سطح پر بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انجمن اقوام متحدہ انسانی حقوق وضع کرنے کی مجاز ہے ؟ کیا اس انجمن کے اراکین انسانی حقوق کا شعور رکھتے ہیں ؟ کیا یہ انسانی احتیاجات و میلانات سے مکمل طور پر آگاہ ہیں ؟ کیا یہ انسان کے انفرادی اور اجتماعی روابط کی باریکیوں سے واقف ہیں ؟ کیا یہ انسان کی جسمانی و نفسیاتی خصوصیات کا عمیق علم رکھتے ہیں ؟۔

جب یہ مسئلہ زیر بحث آتا ہے کہ حقوق و قوانین وضع کرنے کا مجاز کون ہے تو اس بارے میں منکرین دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔

منکرین و فلاسفہ کے وہ گروہ جو دنیا کو محض مادی نظر سے دیکھتے ہیں ' ان کی نظر میں ماوراء مادہ کسی چیز کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور وہ انسانوں کے لئے اصول و ضوابط مقرر اور متعین کرنے کا حقدار صرف انسانوں ہی کو سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تمام قوانین کا سرچشمہ انسانی عقل و وجدان ہے۔ جس طرح انسان انفرادی و شخصی زندگی میں عقل و وجدان کے ذریعہ اپنی ضروریات کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے اسی طرح اجتماعی زندگی میں بھی اس سے فیضیاب ہو سکتا ہے۔ ان کے نزدیک حقوق کی دو اقسام ہیں۔

طبیعی و فطری حقوق

یعنی وہ حقوق جو طبیعت و فطرت کی رو سے انسان کو حاصل ہیں جیسے حصول علم کی آزادی ' مساوات و برابری ' ملکیت کا حق ' سیاسی آزادی ' مذہبی آزادی ' آزادی رائے اور بیان وغیرہ۔ یہ حقوق ثابت و ناقابل تغیر ہیں۔

اجتماعی حقوق

یہ وہ حقوق ہیں جو زمان و مکان کے حالات و کیفیات کے مطابق وضع کئے جاتے ہیں۔ جیسے شہری حقوق' آئینی حقوق' عدالتی حقوق' قانونی مجازات' اور بین الاقوامی حقوق وغیرہ۔

دوسرا گروہ ان موحدین کا ہے جو مبداء و معاد پر ایمان رکھتے ہیں' جو ماوراء مادہ ایک ایسی قادر و توانا ہستی کے قائل ہیں جس نے اس کائنات اور اس کی تمام موجودات کو خلق کیا ہے اور جس کے ہاتھ میں کائنات کا انتظام و انصرام ہے' جس نے انسان کو خلق کیا ہے اور جو اس کی احتیاجات و ضروریات اور رجحانات و میلانات سے آگاہ ہے' جو انسان کی جسمانی و نفسیاتی خصوصیات کا علم رکھتا ہے اور جو انسان کے باہمی روابط کی گہرائیوں سے باخبر ہے۔

اس گروہ کا عقیدہ ہے کہ یہی قادر و توانا' عالم و مقتدر ہستی یعنی اللہ رب العالمین' انسانوں کے لئے قوانین وضع کرنے کا مجاز ہے۔ مادئین کی اس منطق کو کہ انسان خود ہی اپنے لئے قوانین وضع کر سکتا ہے' وہ مندرجہ ذیل دلائل سے مسترد کرتے ہیں:۔

۱ - انسانی عقل اور وجدان عادات و رسوم' افکار و عقائد سے متاثر ہوتے ہیں' پھر یہ کہ ان سے خطا و لغزش کے ظہور کا امکان بھی ہر وقت پایا جاتا ہے لہٰذا ایسے کسی انسان کے وضع کردہ قوانین و ضوابط پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

۲ - عقل اور وجدان انسانی احتیاجات اور اس کے لئے اچھائی اور برائی کے صرف ایک حصے کو درک کر سکتے ہیں' اس بارے میں تمام مسائل خاص طور پر ان کی جزئیات تک رسائی ان کے بس میں نہیں ہوتی۔ خداوند عالم انسان کے اسی جہل اور کم علمی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ:

"اور تمہیں بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔" (سورہ بنی اسرائیل ۱۷- آیت ۸۵)

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

"اور اللہ ہی نے تمہیں شکم مادر سے اس طرح نکالا ہے کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔" (سورہ نحل ۱۶ آیت ۷۸)

فلاسفہ و مفکرین اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ولیم جیمس (Willam James) کہتا ہے کہ:

"ہمارا علم ایک قطرہ کی مانند ہے جبکہ اس کے مقابل ہمارا جہل سمندر کی طرح وسیع ہے۔ ہمارا یہ کہنا کہ "ہم نہیں جانتے" حقیقت سے خالی نہیں۔"

انسٹینٹ (Instant) کہتا ہے:

"کتاب طبیعت نے ہمیں بہت سی چیزیں سکھائی ہیں اور ہم نے اسی قدر طبیعت سے آشنائی حاصل کی ہے' لیکن اسرار طبیعت سے ہم اب بھی بہت دور رہیں۔"

اب ہم مفکرین کے چند ایسے اقوال نقل کرتے ہیں جن میں وہ وضع قانون کے سلسلہ میں انسان کی عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔

روسو (Russou) کہتا ہے:

"بہترین قانون وضع کرنے کے لئے ایک ایسی کامل عقل کی ضرورت ہے جو انسان کی تمام خواہشات کا ادراک رکھتی ہو' خواہشات سے مبرا ہو' انسانی فطرت سے آگاہ ہو اور خود اپنی سعادت کے حصول کے لئے انسانوں کی محتاج نہ ہو۔"

ڈاکٹر کارل کا کہنا ہے:

"تمام علوم جو انسانوں نے اب تک حاصل کئے ہیں ان کی مقدار ان چیزوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے جن سے وہ ناواقف ہیں اور انسان نے اب تک جو ماڈل اور ربوٹ ایجاد کئے ہیں' انسانی بدن ان سے بدرجہا

بہتر ہے۔"

خلاصہ یہ کہ انسان اپنی جہالت کی بنا پر قانون وضع کرنے سے عاجز ہے۔

اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ انسان وسیع علم اور مسلسل تجربہ کے ذریعہ انسانی احتیاجات اور اس کے لئے اچھائی و برائی کی تمیز کر سکتا ہے' تب بھی کیونکہ اس میں خود خواہی' منفعت پرستی اور مصلحت کوشی جیسے عوارض پائے جاتے ہیں اس لئے وہ قوانین وضع کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

الغرض حقوق کا تعین قواعد و کلیات اور حق و عدالت پر مبنی ہونا چاہئے نہ کہ انسانی خواہشات اور افراد یا جماعت کے رجحانات و خیالات کے تابع' لہٰذا آیت قرآن ہے:

"اور اگر حق ان کی خواہشات کا اتباع کر لیتا تو آسمان و زمین اور ان کے مابین جو کچھ ہے وہ سب برباد ہو جاتا۔"

(سورہ مومنون ۲۳۔ آیت ۷۱)

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں شریعت کے دوسرے اصول و ضوابط کی طرح انسانی حقوق کا مصدر بھی قرآن کریم اور سنت معصومین ہیں۔

پہلا مصدر قرآن کریم

اس جانب قرآن کریم اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

"اور ہم نے ان (رسولوں) کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کیا ہے تا کہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں۔" (سورہ حدید ۵۷۔ آیت ۲۵)

"اور کسی مومن مرد یا عورت کو اختیار نہیں ہے کہ جب خدا اور رسول کسی امر کے بارے میں فیصلہ کر دیں تو وہ بھی اپنے امر کے بارے میں صاحب اختیار بن جائے۔"

(سورہ احزاب ۳۳۔ آیت ۳۶)

دوسرا مصدر سنت

ارشاد رب العزت ہے:

"اور جو کچھ بھی رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے رک جاؤ۔" (سورہ حشر ۵۹۔ آیت ۷)

"اور تم لوگ کیوں کر کافر ہو جاؤ گے جب کہ تمہارے سامنے آیات الٰہیہ کی تلاوت ہو رہی ہے اور تمہارے درمیان رسول موجود ہے اور جو خدا سے وابستہ ہو جائے سمجھو کہ اسے سیدھے راستے کی ہدایت کر دی گئی۔" (سورہ آل عمران ۳۔ آیت ۱۰۱)

مصادر حقوق کے بارے میں ہم نے نہایت اختصار کے ساتھ اپنی معروضات پیش کیں۔ گو اس سلسلہ میں بیان کئے گئے تمام مطالب تشریح و توضیح کے محتاج ہیں لیکن دامن وقت میں گنجائش نہ ہونے کے باعث ان پر سیر حاصل گفتگو نہ کر سکے۔ انشاء اللہ خداوند عالم نے توفیق دی تو کسی مناسب وقت پر اس سلسلہ میں مفصل گفتگو کریں گے۔

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

زکوٰۃ کی اہمیت

زکوۃ ان دینی قوانین و ضوابط میں سے ہے جو امم گزشتہ اور شرائع سابقہ میں بھی رائج تھا۔

دین مقدس اسلام میں اسکی اہمیت کے اظہار کیلئے یہی کہہ دینا کافی ہے کہ قرآن کریم کی تقریباً تیس آیات میں اس کا ذکر ہے اور نماز کے قیام کے ساتھ ساتھ زکوۃ کی ادائیگی کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ جیسے

"نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو" (سورہ حج ۲۲۔ آیت ۷۸)۔

یہی نہیں بلکہ زکوۃ کی ادائیگی سے اعراض برتنے والوں کو قرآن کریم سخت عذاب کی خبر بھی دیتا ہے۔

"اور جو لوگ سونا اور چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے پیغمبر آپ انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دیں۔"

(سورہ توبہ ۹۔ آیت ۳۴)

قرآن کریم کے ساتھ ساتھ روایات و احادیث ائمہ معصومین علیہم السلام

بھی زکوۃ کی اہمیت پر روشن گواہ ہیں۔

حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

"نماز کے ساتھ زکوۃ کو خدا کے قرب کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ جو کوئی اسے با رضا و رغبت ادا کرے اس کے لئے یہ گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے اور دوزخ کی آگ سے اس کی حفاظت کرتی ہے۔" (نہج البلاغہ)

آپؑ ہی فرماتے ہیں:

"زکوۃ دینا مت بھولو کیونکہ زکوۃ خدا تعالیٰ کے غضب کو سرد کردیتی ہے" (کتاب سلیم بن قیس)

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

"جو شخص زکوۃ کی کم ترین مقدار (ایک قیراط) دینے سے بھی باز رہے وہ نہ تو مومن ہے اور نہ ہی مسلمان" (وسائل الشیعہ ج ۲ ص ۵)

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں:

"رسول اللہؐ نے ایسے افراد کو جو زکوۃ کو معمولی شمار کرتے تھے اور فقراء کے حقوق ادا نہ کرتے تھے مسجد سے نکل جانے کا حکم دیا اور فرمایا: تم لوگ جو زکوۃ نہیں دیتے' ہماری مسجد سے باہر چلے جاؤ۔"

(من لا یحضرہ الفقیہ۔ ص ۱۵۲

امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے:

"روز قیامت نماز کے بعد سب سے پہلا سوال زکوۃ کے بارے میں کیا جائے گا۔"

(کتاب الفقہ۔ ج ا۔ ص ۱۰۔ باب الزکوۃ

آپؑ ہی کا ارشاد ہے:

"مانع زکوۃ کا خون مباح ہے"۔

(کتاب الفقہ۔ باب الزکوۃ

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں:

"زکوۃ کی ادائیگی کے بغیر نماز قبول نہ ہوگی"۔

فرائض دینی میں زکوۃ کی اہمیت کا اس سے بھی اظہار ہوتا ہے کہ تمام مراجعین اور فقہاء نے اپنے رسالہ عملیہ (توضیح المسائل) میں اسے ایک علیحدہ باب کی صورت میں پیش کیا ہے اور تفصیل کے ساتھ اس کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔

زکوۃ کا تعلق فروع دین سے ہے۔ ہم فروع دین کو دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں' جن میں سے ایک کو نظام بندگی اور دوسرے کو نظام زندگی کا نام دیا جاسکتا ہے۔

نظام بندگی میں ان فروع کو شمار کیا جاتا ہی جو محض خدا اور بندے کے تعلق پر مبنی ہیں جیسے نماز' روزہ اور حج۔ ان فروع میں سب سے اہم نماز ہے۔

نظام زندگی میں جن فروع کا شمار کیا جاتا ہے وہ انسان کی سماجی اور معاشرتی ذمہ داریوں اور فرائض سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے زکوۃ' خمس' جہاد' امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور تولی و تبری۔ ان فروع میں سب سے اہم فرع زکوۃ ہے جس کی تاکید نماز کے ساتھ ساتھ بارہا قرآن کریم میں مذکور ہے۔ قرآن کریم کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ تمام فروع میں سب سے زیادہ تاکید و سفارش انہی دو فروع کے قیام اور ادائیگی کی' کی گئی ہے۔

قرآن کریم اور روایات رسولؐ و آل رسولؐ میں زکوۃ سے متعلق اس قدر تاکید و سفارش کے باوجود ہمارے یہاں اس اہم دینی فریضے کی جانب بے توجہی قابل صد تاسف ہے۔

عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا' خود دینی حلقے اور علماء کرام خمس کی ادائیگی کی تو شدومد سے تاکید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن زکوۃ جیسے اہم دینی فریضے کی بجا آوری کے لئے تاکید و تشویق کے سلسلہ میں چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔ یہی

وجہ ہے کہ اکثر افراد ملت زکوۃ کی ادائیگی سے نہ صرف گریزاں ہیں بلکہ ان کی نظر میں اس اہم دینی فریضہ کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔

وہ اشیاء جن پر زکوۃ واجب یا مستحب ہے

جن اشیاء پر زکوۃ واجب ہے وہ اکثر فقہاء کے نزدیک نو ہیں۔ ہم انہیں تین انواع میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱) مال مویشی:۔ اونٹ' گائے' گوسفند۔

۲) زراعت:۔ گندم' کھجور' جو' کشمش۔

۳) نقدیات:۔ سونا چاندی۔

ان نو اشیاء پر زکات تمام مجتہدین کے نزدیک واجب ہے۔

حضرت امام خمینیؒ' آیت اللہ منتظری اور آیت اللہ اراکیؒ نیز دیگر مجتہدین کے نزدیک بنابر احتیاط واجب سلت اور عدس جو گندم کی مانند فصلیں ہیں پر بھی زکوۃ دینا چاہئے۔

امام خمینیؒ کے نزدیک سبزیوں کے علاوہ زمین سے اگنے والی ہر چیز' مال تجارت' گھوڑی اور پھلوں پر زکوۃ مستحب ہے۔ (تحریر الوسیلہ ج ا۔ ص ۳۱۵)

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی نظر میں اگر تمام دوسری شرائط پائی جائیں تو روپیہ پر بھی زکوۃ ہے۔ (توضیح المسائل۔ ص ۳۲۷۔ مسئلہ نمبر ۱۳۱۹)

آیت اللہ احمد خوانساری فرماتے ہیں کہ زکوۃ نو چیزوں پر واجب ہے اس میں نہ اشتباہ ہے اور نہ ہی اختلاف۔ زکوۃ کے نو چیزوں میں منحصر ہونے کی دلیل درج ذیل احادیث ہیں۔

صحیحہ فضیل میں امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"خدا نے نماز کے ساتھ ساتھ اموال پر زکوۃ کو بھی واجب قرار دیا ہے۔

سنت پیغمبرؐ سے نو اشیاء پر زکوۃ کے واجب ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اسکے

علاوہ دیگر اشیاء پر زکوۃ کو پیغمبرؐ نے معاف فرمایا ہے۔"

اس روایت کے برخلاف دوسری روایات ہر اس دانے پر زکوۃ کو واجب قرار دیتی ہیں جس کا وزن کیا جاسکے۔

ابو مریم امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ:

"میں نے امام سے دریافت کیا کہ زرعی اجناس میں سے کن کن پر زکوۃ واجب ہے۔ امام نے فرمایا: "گندم' جو' ذرۃ' سلت اور عدس' ان سب پر زکوۃ واجب ہے"۔ پھر فرمایا "ہر وہ چیز جس کا ساع سے وزن کیا جائے اور وہ اوساق کو پہنچے اس پر زکوۃ ہے۔"

اسی طرح صحیحہ محمد ابن مسلم میں ہے کہ امامؑ سے دریافت کیا گیا کہ کن کن فصلوں پر زکوۃ ہے تو آپؑ نے فرمایا:

"گندم' ذرۃ' دخن' ارض' سلت' عدس' سمسم اور انہی جیسی دوسری تمام چیزوں پر زکوۃ واجب ہے۔"

آیت اللہ صادقی تہرانی فرماتے ہیں: "زکوۃ سے متعلق تقریباً تیس آیات قرآن ہیں جن میں مطلق مال پر زکوۃ کے واجب ہونے کا ذکر ملتا ہے (کسی اور قسم کی صراحت نہیں پائی جاتی) ایک سو سے زیادہ روایات معصومینؑ ایسی ہیں جو زکوۃ کو صرف نو اشیاء میں محدود قرار نہیں دیتیں بلکہ ہر مال پر زکوۃ کو واجب قرار دیتی ہیں۔ اور جن روایات میں صرف نو اشیاء کے تذکرہ کے بعد اس جملہ کا اضافہ ملتا ہے کہ بقیہ اشیاء پر زکوۃ معاف ہے ان روایات کا راوی معتبر نہیں۔"

(توضیح المسائل۔ ص ۱۸۸)

آیت اللہ شیخ بہاالدین عاملی المعروف شیخ بہائی کے نزدیک ان آٹھ چیزوں پر زکوۃ مستحب ہے (۱) گھوڑی پر (گھوڑی کی سالانہ زکوۃ دو مثقال سونا ہے) (۲) ایسے مال پر جس پر زکوۃ تو واجب تھی لیکن زکوۃ دیتے وقت کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا گیا کہ زکوۃ کی ادائگی سے چھوٹ مل جائے (۳) دکان'

حمام اور مسافر خانہ کی مانند جگہوں کے کرایہ پر (۴) ہر اس چیز پر جو زمین سے اگے اور اس کا وزن کیا جا سکے جیسے چاول' چنا' دالیں وغیرہ (۵) ایسے مال پر جو کئی سال بعد مالک کے اختیار میں آیا ہو تو اس میں سے ایک سال کی زکوۃ ادا کی جائے گی (۶) ایسے مال پر جس کے متعلق مالک کو شک ہو کہ اس پر زکوۃ واجب ہوئی ہے کہ نہیں (۷) مال تجارت پر (۸) بچے کے مال پر اس صورت میں کہ اگر ولی اس سے تجارت کرتا ہو۔(جامع عباسی۔ ص ۱۰۱)

مصارف زکوۃ

تقریباً تمام مراجعین کے نزدیک مصارف زکوۃ آٹھ ہیں۔ ہم یہاں امام خمینی علیہ الرحمہ کی تالیف تحریر الوسیلہ سے ان آٹھ موارد کو بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد بعض موارد سے متعلق دیگر مراجعین اور فقہاء کی آراء نقل کریں گے۔

زکوۃ ان آٹھ مقامات پر صرف کی جائے:۔

۱۔ مسکین پر: یعنی ایسے شخص پر جو بیماری' ضعیفی یا بعض اعضاء بدن کے ناکارہ ہونے کی بنا پر کسب معاش سے عاجز ہو۔

۲۔ فقیر پر: یعنی ایسے شخص پر جو اپنا اور اپنے اہل وعیال کا خرچ برداشت نہ کر سکتا ہو۔

۳۔ زکوۃ جمع کرنے والے کارندوں پر: یعنی ان لوگوں پر جو زکوۃ کی وصولی' اس کی تقسیم اور اس کی حفاظت پر امام یا نائب امام کی جانب سے مامور ہوں۔

۴۔ غلاموں کو آزاد کرنے پر: غلام کو اس کے آقا سے خرید کر آزاد کرنے کے لئے مال زکوۃ خرچ کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ مقروض کے قرض کی ادائیگی پر: ایسے مقروض جو اپنے اوپر واجب الادا قرض ادا نہ کر سکتے ہوں ان کے قرض کی ادائیگی مال زکوۃ سے کی جا سکتی ہے۔

۶۔ ابن سبیل پر: ایسے مسافر پر مال زکوۃ صرف کیا جا سکتا ہے جس کا سفر

مباح ہو اور اثناء راہ میں اسکا خرچ ختم ہو گیا ہو' خواہ ایسا شخص اپنے شہر میں دولت مند ہی کیوں نہ ہو۔ اسے اپنے شہر تک پہنچنے کے لئے مال زکوٰۃ میں سے اس قدر دیا جائے گا کہ وہ اپنی حیثیت کے شایان شان طریقے سے گھر پہنچ سکے۔

۷۔ تالیف قلوب پر: کافروں کو اسلام اور جہاد میں دلچسپی دلانے' تالیف قلوب کرنے اور ضعیف العقیدہ مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کے لئے زکوٰۃ کا ایک حصہ مختص کیا گیا ہے۔ اس قسم کی ادائیگی آج کے دور میں بھی فضول اور فالتو نہیں۔

۸۔ فی سبیل اللہ: زکوٰۃ کا ایک حصہ فی سبیل اللہ خرچ کیا جائے گا۔ اس میں تمام مسلمانوں کی فلاح و بہبود' مثلاً نہروں کی تعمیر' سڑکوں اور راستوں کی تعمیر و مرمت اور جو کچھ اسلام کی بہتری' برتری اور سربلندی کے لئے ضروری ہو گا' شامل ہے۔

(تحریر الوسیلہ۔ ج ا۔ ص ۳۳۸)

مختلف فقہاء اور مجتہدین نے مولف قلوب اور سبیل اللہ کی گوناگوں تفاسیر اور توضیحات کی ہیں ان میں سے چند ایک ذیل میں بیان کی جاتی ہیں۔

مولف قلوب

امام خمینیؒ کے نزدیک: "مولف قلوب سے مراد وہ کفار ہیں کہ جنہیں مسلمان جہاد کے موقع پر اپنے ساتھ ملانا چاہتے ہیں یا جنہیں مذہب اسلام کی جانب مائل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مسلمان بھی مولف قلوب میں شامل ہیں جن کا عقیدہ کمزور ہے' انہیں زکوٰۃ دی جائے تاکہ ان کا دل اسلام کی جانب مائل ہو۔"

آیت اللہ گلپایگانیؒ کے نزدیک مولف قلوب میں وہ کفار شامل ہیں جو اسلام کی جانب مائل ہوں یا جنگ کے موقع پر مسلمانوں کی مدد کریں۔ البتہ کفار کو زکوٰۃ دینے کے سلسلے میں امام کی رضامندی شرط ہے۔

(توضیح المسائل۔ مسئلہ نمبر ۱۹۳۳)

فی سبیل اللہ

امام خمینیؒ فرماتے ہیں کہ "فی سبیل اللہ سے مراد اسلام اور امت مسلمہ کی مصلحت ہے' جیسے پلوں کی تعمیر' راستوں کی تعمیر اور مرمت' اعلاء کلمہ حق اور مسلمانوں کے درمیان سے فتنہ و فساد کو ختم کرنا۔"

(تحریر الوسیلہ۔ ج ۱۔ ص ۳۳۸)

آیت اللہ گلپائیگانی "کی نظر میں فی سبیل اللہ سے مراد ہر وہ عمل خیر ہے کہ جس کی شرع مقدس نے تشویق دلائی ہو جیسے دینی مدارس کا قیام' مساجد کی تعمیر' زائرین کے لئے دار الاقامہ کا قیام' یتیم خانوں کا قیام' دینی شعائر کی تعلیم' دینی کتب کی نشر و اشاعت' نشر معارف اسلامی' نیز ہر وہ کام جو قرب خداوندی کا موجب ہو۔" (توضیح المسائل۔ مسئلہ نمبر ۱۹۳۳)

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کے نزدیک فی سبیل اللہ سے مراد مساجد کی تعمیر' دینی مدارس کا قیام' رفاہ عامہ کے امور' تبلیغ دین' اعزام مبلغین' مفید اسلامی کتب کی نشر و اشاعت' غرض خلاصہ کلام یہ کہ فی سبیل اللہ میں وہ تمام امور شامل ہیں جو راہ خدا میں انجام دئے جائیں۔" (توضیح المسائل۔ مسئلہ نمبر ۱۴۴۱)

زکوۃ کی وصولی

احادیث' روایات' تواریخ اور مراجعین کے فتاوی زکوۃ کی وصولی اور اس کی تقسیم سے متعلق تین صورتیں بیان کرتی ہیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ صاحب نصاب خود اپنے طور پر زکوۃ نکالے اور فقراء و مساکین اور دیگر بیان شدہ مصارف پر خرچ کرے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ حکومت اسلامی صاحبان نصاب سے زکوۃ جمع

کرے اور معین مصارف پر صرف کرے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ فقیہ جامع الشرائط زکوۃ جمع کرے اور شرعی مصارف میں صرف کرے۔

زکوۃ جمع کرنے اور معین شرعی مصارف میں اس کو صرف کرنے کی ایک صورت اور بھی ہے جس کا ذکر ہمیں احادیث و روایات اور فتاوی میں تو نہیں مل سکا لیکن یہ صورت مزاج شریعت کے خلاف نہیں بلکہ عین مطابق ہے۔ یعنی جس طرح فقہاء و مجتہدین کی غیر موجودگی میں دینی' سیاسی' اجتماعی اور سماجی امور کی باگ ڈور عدول مومنین کے ہاتھوں میں ہونی چاہئے اسی طرح اگر کسی خطے میں اسلامی حکومت قائم نہ ہو اور وہاں فقہا و مجتہدین بھی موجود نہ ہوں تو وہاں زکوۃ کی وصولی اور اس کی تقسیم بھی عدول مومنین کے ذریعہ انجام پانا چاہئے۔

---☆---☆---

زکوۃ کی وصولی اور تقسیم ایک مکمل نظام کی متقاضی ہے۔ تاریخ اسلام کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جب اسلامی معاشرہ وجود میں نہ آیا تھا' اسلامی دعوت اپنے ابتدائی مراحل طے کررہی تھی اور اسلامی حکومت وجود میں نہ آئی تھی تو مسلمان اپنی زکوۃ خود ہی نکالتے اور خود ہی تقسیم کرتے تھے۔ پھر آیہ قرآن "پیغمبر آپ ان کے اموال میں سے زکوۃ لے لیجئے۔" (سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۱۰۳)۔ کے نزول کے بعد اور جب حکومت اسلامی قائم ہو چکی تو زکوۃ حکومت کے ذریعہ وصول اور تقسیم کی جانے لگی۔ زکوۃ حکومتی کارندے وصول کرتے اور معین شدہ شرعی مصارف میں اسے خرچ کرتے۔

رسول کریم کی رحلت کے بعد بھی یہ ذمہ داری حکومت ہی کے ہاتھوں انجام پاتی رہی۔ اس سلسلہ میں مانعین زکوۃ سے خلیفہ اول کی جنگ بھی زکوۃ کی وصولی اور تقسیم کے سلسلہ میں حکومت کے کردار کو عیاں کرتی ہے۔

حضرت علیؑ کے دور خلافت میں بھی زکوۃ کی وصولی اور اسکی تقسیم حکومت

ہی کے ذریعہ انجام پاتی تھی۔ اس تاریخی حقیقت کے گواہ امیرالمومنین کے وہ مکتوبات ہیں جو آپؑ نے اپنے دورِ حکومت میں عاملین زکوۃ کو تحریر فرمائے اور جن میں آپؑ نے انہیں زکوۃ کی وصولی اور اسے شرعی موارد میں تقسیم کرنے اور مستحقین تک پہنچانے کے بارے میں ہدایات دیں۔

آپؑ کی ہدایات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"اپنے کام پر تقویٰ کے ساتھ روانہ ہو' کسی مسلمان کو خوفزدہ نہ کرنا' جب کسی بستی میں جانا تو کسی کے گھر میں نہ ٹھہرنا' نرم روئی سے پیش آنا' افسرانہ ٹھاٹ باٹ اور ترش روئی اختیار نہ کرنا' خوشی اور رغبت سے جو زکوۃ ادا کرے اس سے وصول کرنا' زکوۃ کی وصولی کے وقت نرمی اور متانت کا مظاہرہ کرنا' اگر کسی کے پاس مال مویشی ہوں تو اس کے گلے میں اس کی اجازت کے بغیر داخل نہ ہونا' زکوۃ کی وصولی کے لئے مال کی تقسیم کرتے وقت مال کا انتخاب مالک پر چھوڑنا' لیکن کوئی بوڑھا لنگڑا' مریل اور بیمار جانور نہ لینا۔ زکوۃ ایسے فرد کے سپرد کرنا جس کی دینداری پر تم کو کامل اعتماد ہو' ایسے آدمی کے سپرد کرنا جو خیر خواہ' رحمدل' امین' حفاظت کرنے والا اور جانوروں کے حق میں بے رحم نہ ہو۔

مال لے کر سستی کئے بغیر ہمارے پاس چلے آنا ہم اس مال کو حکمِ الٰہی کے مطابق ٹھکانے لگا دیں گے۔

اس حصہ میں تمہارا حصہ مقرر اور حق معین ہے۔ مگر اس میں غریب' کمزور' فاقہ زدہ اور نادار لوگ بھی تمہارے شریک ہیں۔ ہم تمہیں پورا پورا حق دیں گے لہٰذا تم بھی اپنے شریکوں کو ان کا پورا پورا حق دینا۔ سب سے بڑی خیانت امت کی خیانت ہے اور سب سے بڑی دغابازی امام سے دغابازی ہے۔"

(خلاصہ مکتوب نمبر ۲۵ اور ۲۶)

رسول کریمؐ اور ان کے بعد تمام خلفاء کی طرف سے زکوۃ کی وصولی کے لئے عاملین کا تقرر اور مصرف زکوۃ کی شقوں کا مطالعہ اس حقیقت کے اثبات کے لئے کافی ہے کہ زکوۃ کی وصولی اور اس کی تقسیم حکومت اور امام کی ذمہ داری و فرائض میں شامل ہے۔

تقریباً تمام مراجعین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زمانہ غیبت معصومؑ میں زکوۃ کی وصولی اور تقسیم کا نظام مجتہد جامع الشرائط کی زیر نگرانی ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہم چند مجتہدین کے فتاوی نقل کرتے ہیں۔

حضرت امام خمینیؒ فرماتے ہیں: "افضل بلکہ احوط یہ ہے کہ زکوۃ (زمانہ غیبت معصومؑ میں) ایک مجتہد فقیہ کو دی جائے۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ وہ طلب بھی کرے۔ کیونکہ وہ موقع و محل کے مطابق اس کے خرچ کرنے کو بہتر سمجھتا ہے۔ اگرچہ اقوی یہ ہے کہ یہ عمل واجب نہیں ہے علاوہ اس صورت میں جبکہ وہ اسلام و مسلمین کی مصلحت کی بنا پر طلب کرے (اس وقت اس کی اتباع واجب ہے) اگرچہ اس مجتہد کی تقلید نہ بھی کرتا ہو۔"

(تحریر الوسیلہ۔ ج ا۔ ص ۳۴۲۔ مسئلہ ۵)

آیت اللہ ابوالحسن اصفہانیؒ کے بقول: "احوط یہ ہے کہ زمانہ غیبت امامؑ میں زکوۃ فقیہ کو دی جائے' خاص طور پر اس وقت جبکہ وہ طلب بھی کرے۔ کیونکہ وہ اس کے مصرف سے بہتر آگاہ ہے۔ اگرچہ اقوی عدم وجوب پر ہے سوائے یہ کہ اگر وہ بعنوان حکم طلب کرے اسوقت واجب ہے کیونکہ وہ مصلحت پر نگاہ رکھتا ہے۔"

آیت اللہ محسن الحکیمؒ کے نزدیک: "اقوی یہ ہے کہ زمانہ غیبت امامؑ میں فقیہ کو زکوۃ دینا واجب نہیں اگرچہ افضل و احوط ہے۔ اگر وہ کسی خاص مقصد کے لئے واجب کے طور پر زکوۃ طلب کرے تو اس وقت اس کے مقلدین پر زکوۃ کی ادائیگی واجب ہے بلکہ غیر مقلدین پر بھی احوط واجب ہے۔"

(منہاج الصالحین۔ آقائی حکیم۔ ص ۲۴۲۔ مسئلہ ۳۳)

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی نظر میں: "جب حاکم شرع مقتدر ہو اور احکام اسلامی کو نافذ کر سکتا ہو تو احتیاط واجب یہ ہے کہ زکوۃ اسی کو دی جائے' یا اس کی اجازت سے صرف کی جائے۔ اگر اس وقت خود کوئی شخص بغیر حاکم کی اجازت کے اپنی زکوۃ کو تقسیم کرے تو اس عمل میں اشکال ہے۔"

(توضیح المسائل۔ مسئلہ نمبر ۳۳۹۔ ص ۱۶۷۳)

یہاں تک کی گفتگو سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ زکوۃ کی وصولی اور تقسیم' حکومت اور امام اور ان کی غیر موجودگی میں مجتہد جامع الشرائط کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

اب سوال یہ پیش آتا ہے کہ کیا ہر حکومت زکوۃ جمع کرنے کی اہل ہے۔ زکوۃ ادا کرتے وقت کس حد تک حکومت کی اہلیت اور نااہلی کو مد نظر رکھا جائے۔

کیا نااہل حکومت کو زکوۃ ادا نہیں کی جاسکتی؟

یہاں گفتگو کو واضح اور سادہ بنانے کے لئے ہم حکومتوں کی چند اقسام بیان کر کے تاریخی حقائق اور شرعی ضوابط کی روشنی میں اپنا موقف پیش کریں گے۔

۱۔ غیر شیعہ حکومتیں

شیعہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول مقبولؐ نے اپنے بعد خلیفہ کا اپنی حیات ہی میں تعین فرما دیا تھا اور حضرت علیؑ کو یہ بار گراں سپرد کر دیا تھا۔ لیکن رسول کریمؐ کی رحلت کے بعد اس منصب جلیلہ پر غیروں نے قبضہ کر لیا اور حضرت علیؑ کو ان کے حق سے محروم کر دیا۔ حضرت علیؑ نے پیکر اسلام کی حفاظت اور امت مسلمہ کے اتحاد کی خاطر حنظل سے زیادہ تلخ گھونٹ گوارا کر لیا اور اسلام کو تباہی اور مسلمانوں کو کشت و خون سے محفوظ رکھنے کیلئے خاموشی اختیار کر لی۔

اس طرح شیعوں کے نزدیک ہر وہ حکومت غیر قانونی' غیر شرعی اور غیر شیعہ

ہے جس کے فرمانروا حضرت علیؑ اور ان کے بعد ان کے گیارہ معصوم جانشین اور ان کی غیبت میں ان کے معین کردہ افراد نہ ہوں۔ لیکن اس باغباں کی طرح جس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ یہ گلشن جسے اس نے خون دل سے سینچا ہے خواہ کسی کے ہاتھوں میں رہے آباد رہے اور اس کے پھولوں کی مہک صدا سلامت رہے، امیرالمومنین کی بھی یہ تمنا رہی کہ یہ نومولود (اسلام) خواہ کسی کی گود میں ہو پھلے پھولے، سلامت رہے۔

اسی مقدس تمنا اور عظیم مقصد کے پیش نظر آپؑ نے ہر مشکل وقت میں حکومت کا ساتھ دیا اور اسے صائب مشوروں سے نوازا۔

جب مانعین زکوۃ کا مسئلہ درپیش ہوا اور مدینہ کے اطراف و اکناف کے قبائل نے حضرت ابوبکر کو زکوۃ دینے سے انکار کردیا تو خلیفہ نے اس مسئلہ کے حل اور اس کے تدارک کے لئے کبار صحابہ کی ایک مجلس تشکیل دی جس میں امیرالمومنین بھی شامل تھے۔

جب مانعین زکوۃ نے مدینہ کا محاصرہ کرلیا اور مدینہ پر حملے کا خطرہ درپیش ہوا تو آپ بھی مدینہ کے دفاع کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

(سیرت ائمہ اثنا عشر از ہاشم معروف۔ ص ۳۵۲)

ایسے ہی مواقع کی نشاندہی آپؑ کے اس مکتوب سے ہوتی ہے جو آپؑ نے اپنے وفاشعار صحابی مالک اشتر کے ساتھ اہل مصر کے لئے روانہ کیا۔ آپ فرماتے ہیں:

"اللہ سبحانہ تعالی نے محمدؐ کو تمام دنیا کے لئے نذیر اور تمام انبیاء کا شاہد بنا کر بھیجا۔ پھر جب رسولؐ گزر گئے تو مسلمانوں میں حکومت پر اختلاف ہوا۔ بخدا میرے تصور میں بھی نہ تھا کہ عرب رسول اللہؐ کے بعد اس منصب کو اہل بیتؑ سے دور کردیں گے بلکہ مجھے یقین تھا کہ معاملہ میرے ہاتھ ہی میں رکھیں گے۔ لیکن دیکھتا کیا ہوں کہ لوگ فلاں کی

بیعت پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس پر میں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ یہاں تک کہ لوٹنے والے اسلام سے لوٹ گئے اور محمدؐ کے دین کو مٹانے کی دعوت دینے لگے۔ تب میں ڈرا کہ اگر اسلام اور اہل اسلام کی تائید و نصرت پر کھڑا نہ ہوں گا اور اسلام میں شگاف پڑجائے گا تو تمھاری حکومت کے فوت ہوجانے سے کہیں بڑی مصیبت مجھ پر آپڑے گی۔ تمھاری یہ حکومت ہے بھی کیا۔ متاع چند روزہ۔ اسی طرح زائل ہوجائے گی جس طرح سراب زائل ہوجاتا ہے' یا بدلی چھٹ جاتی ہے۔ ان واقعات کو دیکھ کر میں اٹھ کھڑا ہوا یہاں تک کہ باطل مٹ گیا اور دین کو اطمینان اور تسلی ہوگئی۔" (مکتوب نمبر ۶۲)

۲۔ شیعہ دشمن حکومتیں

تاریخ ائمہؑ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ائمہ علیہم السلام نے ہمیشہ حکومتوں پر تنقید جاری رکھی اور شیعہ دشمن حکومتوں سے تو ائمہؑ کا جنگ وجہاد بھی تاریخ کا حصہ ہے۔ اس کے باوجود ائمہؑ نے کبھی ان حکومتوں کو زکوۃ ادا نہ کرنے کا علانیہ فرمان جاری نہیں کیا۔

زکوۃ کا مصرف مصالح عمومی ہیں جبکہ خمس خاص اہل بیتؑ کا مال ہے۔ اس کے باوجود جب امام حسنؑ اور معاویہ میں صلح ہوئی تو اس کی ایک شرط یہ تھی کہ افریقہ کا خمس امام حسنؑ کو دیا جائے گا۔

معاہدہ کی اس شق سے ایک نکتہ تو یہ روشن ہوتا ہے کہ خمس بھی حکومت ہی اکٹھا کیا کرتی تھی اور دوسرے یہ کہ امام حسنؑ نے حکومت کی جانب سے زکوۃ کی وصولی اور تقسیم پر کوئی تعرض نہ کیا۔

معاویہ نے حضرت علیؑ اور ان کے شیعوں کے خلاف جو اقدامات کئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ بیت المال مسلمین نے (جس کا بڑا اور مستقل حصہ مال زکوۃ سے تشکیل پاتا ہے) شیعان علیؑ کا وظیفہ منقطع کردیا۔ اس اقدام سے

بھی واضح ہے کہ معاویہ کے دور میں زکوۃ کی وصولی اور تقسیم حکومت ہی کے ہاتھ میں تھی اور شیعیان علیؑ کو بھی اس سے استفادہ کا حق حاصل تھا جو ان سے چھین لیا گیا تھا۔

ظاہر ہے جب حکومتوں کا نظام اسلامی نہ ہو تو وہ کسی طور بھی زکوۃ کی وصولی اور تقسیم کی اہل نہیں۔ صحیحہ زرارہ اور محمد بن مسلم میں ہے کہ ان دونوں نے ابو عبداللہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ خدا تعالیٰ کا ارشاد کہ "انما الصدقات للفقراء والمساکین" "صدقات صرف فقراء اور مساکین کے لئے ہیں" (سورہ توبہ ۹۔ آیت ٦۰) تو آیا ہم ان تمام لوگوں کو زکوۃ دیں خواہ وہ صاحب معرفت (اھل بیتؑ) نہ ہوں۔ امام نے جواب دیا۔ "اے زرارہ اگر زکوۃ فقط اسی کو دی جاسکتی ہوتی جو معرفت رکھتا ہے اور جو معرفت نہیں رکھتا اسے نہ دی جاسکتی ہوتی تو پھر اس کا کوئی اور محل نہ ہوتا۔ پس جو معرفت نہیں رکھتا اسے بھی زکوۃ دی جاسکتی ہے تاکہ وہ دین میں رغبت کرے اور اس پر ثابت قدم ہو جائے لیکن آج کے زمانہ میں تم اور تمھارے اصحاب سوائے صاحب معرفت کے کسی کو زکوۃ نہ دیا کرو۔"

(وسائل الشیعہ ج ٦ ص ۱۴۳)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوۃ تشریع اولی کے لحاظ سے امام اور حکومت ہی کے تصرف میں ہوتی ہے اور وہ اس سے اپنی رعایا کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ لیکن جب حکومت پر ایسے لوگ قابض ہوں جو اس کے اہل نہیں اور زکوۃ درست جگہ صرف نہ ہوتی ہو اور مومنین محروم رہتے ہوں تو پھر امام نے شیعوں کو حکم دیا کہ وہ ان کے حق کے عارف لوگوں کو زکوۃ دیں۔ یہ ایک موقت حکم ہے جو جعل اولی کی طبع اور مزاج کے برخلاف ہے۔

(ولایت فقیہ ج ۱ ص ۹۸)

غیر اسلامی حکومتیں

غیر اسلامی حکومتوں سے مراد ہر وہ حکومت ہے جس کی بنیاد غیر اسلامی افکار و نظریات پر رکھی گئی ہو اور جس پر غیر اسلامی نظام حکم فرما ہو' خواہ ان حکومتوں کی رعایا مسلمان ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ آج اکثر اسلامی مملکت کا حال ہے کہ وہ اپنے کو اسلامی ممالک کے بطور متعارف کرنا بھی پسند نہیں کرتے جیسے ترکی جہاں سیکولرزم حکم فرما ہے' عراق جو سوشلسٹ ہے وغیرہ وغیرہ... حد تو یہ ہے کہ جو ممالک اسلامی ہونے کا دعوی کرتے نہیں تھکتے' ان کے نظامہائے حکومت پر بھی اگر نظر ڈالی جائے تو کہیں سیکولرزام ہے' کہیں بادشاہت ہے اور کہیں کچھ اور.....

ظاہر ہے جن حکومتوں کا نظام اسلامی نہیں' وہ کسی طور بھی زکوۃ کی وصولی اور تقسیم کی اہل نہیں۔ ایسی حکومتوں کو نہ صرف یہ کہ خود زکوۃ ادا نہیں کرنی چاہئے بلکہ دوسرے مسلمان بھائیوں اور دینی حلقوں پر ان کی غیر اسلامی حیثیت متعارف کرا کے اور ان کے چہروں سے اسلامی نقاب اتار کر' انہیں بھی ان حکومتوں کو زکوۃ کی ادائیگی سے منع کرنا چاہئے۔

سنت و سیرت ائمہ معصومینؑ اور مراجعین کے فتاوی کی روشنی میں یہ بات عیاں ہے کہ زکوۃ کی وصولی اور اسکی تقسیم حکومت اسلامی کی ذمہ داری ہے۔ لیکن غیر شیعہ حکومت کی موجودگی میں' اگر کسی بڑے حرج و مرج سے محفوظ رہتے ہوئے ممکن ہو تو شیعہ حضرات اپنی زکوۃ کی وصولی اور تقسیم کا نظام خود اپنے طور پر تشکیل دیں کیونکہ یہی عقل و شرع کے لحاظ سے مناسب ہے۔

چند تجاویز

اپنی بے بضاعتی کے احساس کے ساتھ چند تجاویز حاضر خدمت ہیں جن میں سے تجویز نمبر ۲ اور ۳ کو متبادل کے طور پر بھی منتخب کیا جا سکتا ہے۔

(۱) چونکہ فقہ جعفریہ میں روپیہ پر زکوۃ واجب نہیں اس لئے جب ضیاالحق کے دور میں حکومت نے نقد رقم سے زکوۃ کی کٹوتی کا اعلان کیا تو ملت جعفریہ سراپا احتجاج بن گئی اور روپیہ پر زکوۃ کی ادائیگی سے انکار کردیا۔ ملت کے بھرپور احتجاج کے نتیجہ میں حکومت کو ملت جعفریہ کو زکوۃ سے مستثنیٰ قرار دینا پڑا۔

نوٹوں پر زکوۃ کی ادائیگی کے خلاف ملت کے احتجاج اور اس کے نتیجہ میں حکومت کے فیصلہ بدلنے کے بعد شیعہ دشمن فرقہ پرست عناصر نے فقہ جعفریہ کے ماننے والوں کے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کردیا کہ یہ نعوذباللہ زکوۃ ہی کے منکر ہیں۔ اس طرح وہ لوگ جو پہلے ہی شیعوں کے بارے میں لاعلمی یا منفی پروپیگنڈے کی وجہ سے شکوک و شبہات کا شکار تھے' ان کا شک و تردد شیعوں سے نفرت میں تبدیل ہوگیا۔ لیکن صد افسوس کہ ملت کی جانب سے اب تک اس منفی پروپیگنڈے کا کوئی مناسب جواب نہیں دیا گیا۔

اس سلسلہ میں ہماری تجویز ہے کہ مختلف مواقع اور مناسبات پر برملا' معتبر اور مستند ذرائع سے اس بات کا ابلاغ کیا جائے کہ فقہ جعفریہ میں زکوۃ ضروریات دین میں سے ہے اور ملت جعفریہ زکوۃ کی منکر نہیں بلکہ ہمارے یہاں فقہا و مجتہدین کی اکثریت نے قرآن اور سنت سے استخراج کے ذریعہ نوٹوں کو زکوۃ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور صرف نو اشیاء پر زکوۃ کو واجب قرار دیا ہے۔ جن کی تفصیل ہماری فقہ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

(۲) حکومت کی جانب سے زکوۃ کی کٹوتی سے مستثنیٰ ہوجانے اور دینی حلقوں اور علماء کرام کی جانب سے زکوۃ کی اہمیت کا خاطر خواہ احساس نہ دلائے جانے کی وجہ سے افراد ملت میں یہ تاثر عام ہے کہ زکوۃ کی ادائیگی ان پر فرض نہیں جبکہ ان افراد ملت میں بڑے بڑے سرمایہ دار اور زمیندار بھی شامل ہیں جن پر لازماً زکوۃ واجب ہوتی ہے۔

ملی سطح پر زکوۃ کی وصولی اور تقسیم کا ایک نظام تشکیل دیا جائے تاکہ ایک

طرف تو زکوۃ ادا نہ کرنے والے افراد ملت اپنے اس فریضے سے سبکدوش ہوں اور دوسری طرف ملت کی فلاح و بہبود اور مکتب کی ترقی و ترویج کے لئے خطیر رقم مہیا ہو سکے۔

(۳) دوسرے اسلامی فرقوں اور دینی جماعتوں کے اشتراک سے زکوۃ کی وصولی اور تقسیم کا ایک نظام تشکیل دینے کی داغ بیل ڈالی جائے تاکہ زکوۃ کی خطیر رقم سیکولر اور لادین حکومتوں اور ابن الوقت افراد کی دستبرد سے محفوظ رہ سکے اور اس گرانقدر مالی ذریعہ سے اسلامی حکومت کے قیام، تبلیغ دین، اعلائے کلمہ حق اور محروم طبقات کی حمایت و اعانت جیسے اعلی مقاصد کو تقویت پہنچائی جائے۔

والسلام

۳ شعبان المعظم ۱۴۱۲ھ

پاکستان میں تشیع کی سیاسی صورتِ حال

آیات عظام، حج الاسلام، دانشندان ذوی العزو الاحترام کی خدمت میں عرض سلام کرتا ہوں۔

مجمع جہانی اہل بیتؑ کے دوسرے عالمی اجتماع کے موقع پر اطراف و اکناف عالم سے آئے ہوئے شیعیان و پیروان اہل بیتؑ کے سامنے ہر قسم کی مبالغہ آمیزی سے گریز کرتے ہوئے واضح اور صریح الفاظ میں اپنے وطن پاکستان میں اہل تشیع کی صورت حال اور اس میں پائی جانے والی خامیوں کے ازالہ کے لئے ممکنہ تجاویز پیش کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ بزرگان ملت، علمائے اعلام اور دانشندان و ماہرین ان کا گہری نظر سے جائزہ لے کر لائحہ عمل طے کر سکیں۔ اگرچہ ہم طے ہونے والے لائحہ عمل، منظور کی جانے والی قراردادوں اور تجاویز کو جامہ عمل پہنائے جانے کے سلسلے میں زیادہ پر امید نہیں ہوتے۔ اسی طرح اس قسم کے اجتماعات کی مجموعی طور پر افادیت سے بھی ہم مطمئن نہیں لیکن کیونکہ ائمہ معصومینؑ کو اپنے ماننے والوں کا جمع ہونا پسند ہے، اس لئے ائمہؑ کی یہ پسندیدگی ہی ہمیں ان اجتماعات میں کھینچ لاتی ہے۔ نیز ہم اس لئے بھی ان اجتماعات میں شرکت کو پسند کرتے ہیں کہ نظام مقدس جمہوری اسلامی ایران جو

اس صدی میں مسلمانوں کے لئے' بالخصوص اہل تشیع کے لئے خداوند عالم کی طرف سے ایک عنایت اور کوثر کی حیثیت رکھتا ہے' ہم چاہتے ہیں کہ کوئی ایسی سبیل پیدا ہو جائے کہ ان اجتماعات کے ذریعے اس کی طیب و طاہر جڑوں کو ایسا استحکام اور نشوونما حاصل ہو کہ اس کا تناور درخت شرق و غرب پر سایہ فگن ہو جائے۔

ہم جن حقائق کو پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں' وہ بعض سماعتوں کے لئے ناگوار ہوں گے اور ممکن ہے وہ اس کی توجیہ کرتے ہوئے ہم پر گرفت کریں اور ہمارے خلاف بدگمانی کا موجب ہوں۔ لہٰذا یہ وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم قرآن و سنت پر مبنی اس نظام سے انحراف اور اس کی مخالفت کو کفر و شرک کے مترادف سمجھتے ہیں اور رہبر معظم اور اس نظام کے عمائدین کے بارے میں اپنے جذبات کو زیارت جامعہ کے ان کلمات کے ذریعے بیان کرتے ہیں کہ "موال لکم لاولیائکم مبغض لاعدائکم" (آپ سے اور آپ کے چاہنے والوں سے محبت رکھتا ہوں اور آپ کے دشمنوں کا دشمن اور مخالف ہوں۔)

ہم نے اپنی بے بضاعتی کے باوجود بانیان سیمینار کے دیئے ہوئے عناوین کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک مقالہ تیار کرنے کی کوشش کی ہے جو ہدیہ سامعین ہے۔

تشیع کی سیاست کی اصل صورت حال

پاکستان میں شیعوں کی سیاسی صورت حال' وہاں کی پارلیمنٹ میں شیعہ نمائندوں کی تعداد اور سیاست میں شیعوں کے اثر و نفوذ کا جائزہ لینے سے پہلے ہمیں یہ متعین کرنے کی ضرورت ہے کہ شیعہ سے ہماری کیا مراد ہے؟ اگر ہم یہاں محض ایسے فرد کو شیعہ سمجھ رہے ہیں جو شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں' یا خود کو شیعہ کہلواتے ہیں اور شیعوں سے مخصوص بعض مذہبی رسوم انجام دیتے ہیں تو پاکستان میں ایسے بہت سے افراد ہمیشہ پارلیمنٹ میں رہے ہیں' وزارتوں پر

فائز رہے ہیں، مشیر بھی رہے ہیں اور بعض فوج کے راستے سے مملکت کی صدارت کے منصب تک بھی پہنچے ہیں جیسے اسکندر مرزا اور یحییٰ خان اور صوبائی گورنر بھی رہے ہیں جیسے موسیٰ خان۔

اگر ہم اسی قسم کے شیعوں کے سیاسی اثر و نفوذ کے خواہاں ہیں تو پھر اس مقصد کے لئے ہماری کوششیں تحصیل لاحاصل کے لئے جدوجہد کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

لیکن اگر ہم فکر تشیع کے حامل افراد کے سیاست میں اثر و نفوذ کی خواہش رکھتے ہیں، ایسے لوگوں کو میدان سیاست میں موثر دیکھنا چاہتے ہیں جو بتدریج شیعیت کے غلبہ کا سبب بنیں تو اس سلسلہ میں اب تک ہماری کارکردگی صفر ہے، ہمیں اس کے لئے ایک طویل عرصہ سنجیدگی کے ساتھ جدوجہد کی ضرورت ہے۔

پہلے ہم شیعوں کے سیاسی کردار کا جائزہ لیں گے اور اس کے بعد اس کے ازالہ کے لئے کچھ تجاویز پیش کریں گے۔

اہل تشیع کی سیاست دو محوروں کے گرد گھومتی ہے۔

ایک محور کا دائرہ انتہائی وسیع ہے، جس میں پوری دنیا کے گوشہ و کنار میں زندگی بسر کرنے والے تمام شیعوں کو شامل ہونا چاہئے کیونکہ اس دائرہ سے دوری یا علیحدگی، شیعیت سے دوری اور علیحدگی متصور ہوگی۔

شیعہ سیاست کا دوسرا محور علاقائی اور مقامی نوعیت کی سیاست ہے۔ یہاں پہلے محور کے کلی اصولوں سے رہنمائی لیتے ہوئے ان کی مخالفت کے بغیر، اپنی تعداد، اپنے علاقہ اور خطے کی جغرافیائی حیثیت، حاوی سیاسی نظام، انتخابی طریقہ کار اور اسی طرح کے دوسرے مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے سیاست اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے یہ سیاست ہر خطہ اور علاقہ میں مختلف ہوگی اور اس میں بغیر کسی مناسبت کے ایک علاقہ کا دوسرے علاقہ کی تقلید کرنا درست نہیں ہوگا۔ اگرچہ بدقسمتی سے بے سوچے سمجھے ایسی تقلیدی سیاست کا رواج

ہمارے یہاں پایا جاتا ہے۔

سیاست کے مذکورہ بالا دونوں محوروں کو ائمہ اطہارؑ کی سیرت میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ائمہؑ کی اختیار کردہ سیاسی روش میں سب سے پہلا نکتہ حکومت الٰہی کا قیام ہے اور ہر شیعہ خواہ وہ کسی بھی جگہ زندگی بسر کرتا ہو ائمہؑ کی سیاست کا یہ بنیادی ہدف اس کے ذہن میں موجود ہونا چاہئے اور اسے اس سے وابستہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ شیعوں کا سیاسی کردار اپنے اپنے علاقوں میں اسلامی حکومت کے قیام کو اپنی اہم ترین اور واجب ترین ذمہ داری قرار دیتے ہوئے' لادین سیاسی قوتوں کی بیخ کنی' دینی قوتوں کے ہاتھوں کی مضبوطی اور اسلامی اصول و اقدار کی پاسداری ہونا چاہئے۔ اور اس سلسلے میں ائمہؑ کا سیاسی لائحہ عمل' غلبہ اور اقتدار کی صورت میں بھی شیعوں کے لئے مشعل راہ ہے اور اقلیت اور حزب اختلاف میں ہونے کی صورت میں بھی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

بیان کردہ اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے اگر ہم پاکستانی شیعوں کی سیاست کا مختصر طور پر منطقی انداز میں جائزہ لیں تو یہاں خصوصاً ۱۹۷۷ء کے بعد شیعوں کا سیاسی کردار انتہائی خراب رہا ہے' ان کی سیاسی روش اس انداز کی رہی کہ وہ حکومت کی آنکھ کا کانٹا بن کے رہ گئے' جس کے نتیجے میں شیعوں کو بہت زیادہ نقصانات اٹھانے پڑے جن کا تسلسل اب بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

اگر اس صورت حال کا سبب دریافت کیا جائے تو ہمارے نزدیک اس کی اہم ترین وجہ' شیعہ عمائدین میں شیعہ فکر پر مبنی سیاسی تدبر کا فقدان اور اہل قیادت کا نہ ہونا ہے۔ شیعہ دینی عمائدین برسرزمین حقائق کا ادراک کئے بغیر ایرانی علماء کی نقالی میں اچانک میدان سیاست میں کود پڑے۔ مجمع کی گزشتہ کانفرنس میں آیت اللہ ہاشمی رفسنجانی نے ایرانی علماء کی من و عن تقلید کے رویہ کی سخت الفاظ میں مخالفت کی تھی اور واضح کیا تھا کہ یہاں علماء برسراقتدار ہیں اس لئے اس انداز میں گفتگو کرتے ہیں اور ایران سے باہر کے علماء طاغوتی

اقتدار کے زیر تسلط ہیں' اس لئے ان کے سیاسی کردار میں فرق ہونا چاہئے۔

الغرض پاکستانی علماء میں سیاسی بصیرت کے فقدان کی وجہ سے ' غیر علماء سیکولر ذہنیت رکھنے والے یا جذباتی عناصر نے علماء کو استعمال کیا۔

جب ۱۹۸۰ء میں مختلف اندرونی اور بیرونی عوامل کی بناء پر جنرل ضیاء نے بعض اسلامی قوانین کے نفاذ کا اعلان کیا اور اسی طرح بعد میں بے نظیر بھٹو کے دوسرے عرصہ اقتدار میں شریعت بل اسمبلی میں پیش کیا گیا تو شیعوں نے ان دونوں کی مخالفت کی جس کے نتیجے میں پاکستان میں موجود شیعہ معاند حلقوں اور سازشی استعماری قوتوں کو اپنے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ یہ پروپیگنڈہ کرنے کا موقع ملا کہ شیعہ دراصل اسلام دشمن ہیں' نفاذ اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

ہم قائد شہید عارف حسین حسینی اعلی اللہ مقامہ کے زہد و تقویٰ اور بلند کردار کے دل سے معترف ہیں۔ لیکن ان کے دور قیادت میں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کا عملی اور انتخابی سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ ہماری نظر میں درست نہ تھا۔ میں انتہائی ذمہ داری سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ اس فیصلے میں شہید عارف صمیم قلب سے شریک نہ تھے' میں اس لئے یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں ان کے انتہائی قریب تھا' تحریک کے اجلاسوں میں اس فیصلے کی مخالفت کیا کرتا تھا جس کی گواہی تحریک کے آج کے نمائدین اور قائدین بھی دیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے بارہا ان سے خلوت میں کہا تھا کہ آپ اس خلوت میں مجھے اس فیصلے کی اصابت کے متعلق قائل کردیں تاکہ میں اجلاسوں میں اس کی مخالفت نہ کروں' لیکن انہوں نے مجھے نہ ہی اجلاسوں میں مخالفت سے روکا اور نہ ہی اس فیصلے کی اصابت کا قائل کرنے کی کوشش کی۔

ہم اس انداز سیاست کے بالکل مخالف رہے اور اس کے کئی اسباب ہیں:۔

☆ - ایک یہ کہ پاکستانی عوام کی بھاری اکثریت اہل سنت والجماعت پر

مشتمل ہے۔ سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر ہمارا دعویٰ ایک طرف لیکن حقیقتاً پاکستان میں شیعہ ایک قلیل تعداد میں ہیں لہٰذا یہاں کی قانون سازی میں پبلک لا اکثریتی فقہ کی بنیاد پر بنایا جائے گا۔ اگر اسے روکا جائے تو سیکولر عناصر کے ہاتھ مضبوط ہوں گے۔

☆ - الیکشن میں علیحدہ شیعہ تشخص کے ساتھ حصہ لینے میں فرقہ واریت کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور مسلم اتحاد اور امت واحدہ کے اس تصور کی نفی ہوتی ہے جس کے داعی حضرت امام خمینی علیہ الرحمہ تھے۔

☆ - پورے پاکستان میں کوئی ایسا حلقہ انتخاب نہیں جہاں اتنی بڑی شیعہ آبادی ہو کہ کوئی شیعہ اپنے مذہبی تشخص کے ساتھ کامیاب ہو سکے۔ اس حوالہ سے ہمارے بعض لوگ جماعت اسلامی کی مثال پیش کرتے ہیں' جو سراسر غلط ہے کیونکہ جماعت اسلامی کو اس کے ممبران کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ووٹ دیتے ہیں لیکن کسی مذہبی تشخص رکھنے والے شیعہ کو کوئی سنی ووٹ دے' یہ ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں بعض احباب لبنان کی مثال بھی دیتے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ لبنان میں شیعہ علاقہ بالکل علیحدہ ہیں۔

پاکستان کے ایسے علاقے جہاں شیعہ بڑی تعداد میں رہتے ہیں وہاں بھی چونکہ مجموعی طور پر شیعوں کی مذہبی صورت حال مخدوش ہے' اس لئے وہ فخریہ طور پر سیکولر اور لادین پارٹیوں کا ساتھ دیتے ہیں' شیعہ مذہبی جماعتوں کی ان پر کوئی گرفت نہیں۔ اسی لئے مثلاً کراچی جہاں بعض علاقوں میں کثیر تعداد میں شیعہ بستے ہیں وہاں شیعہ مذہبی جماعتیں ان کے ووٹوں کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال نہیں کرا سکیں' یا بلتستان جہاں ۹۹ فیصد شیعہ آبادی ہے اور جہاں کے الیکشن میں کامیابی کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے' اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو وہاں شیعی سیاست اور نظریہ ولایت فقیہ پر ایک سنگین ضرب لگی ہے۔ وہاں تحریک نے پیسہ بھی استعمال کیا اور ولی فقیہ کی حمایت کا بھی سہارا لیا لیکن

کیونکہ ان کے امیدواروں کی اہلیت کا کوئی پیمانہ نہ تھا' اس لئے کم و بیش وہی افراد ممبر بنے جو پہلے بھی ممبر بنتے رہے تھے۔ اس سلسلہ میں دو نکات قابل ملاحظہ ہیں۔

☆ - مجموعی طور پر اہل بلتستان ولی فقیہ کی متابعت کرتے ہیں لیکن جب انہوں نے ولی فقیہ کی حمایت کے حامل ایسے نااہل افراد کو امیدوار بنتے دیکھا جن سے وہ اچھی طرح واقف ہیں تو ولی فقیہ کے ادارے پر ان کا اعتماد مجروح ہوا' جس کا لازمی نتیجہ نظریہ ولایت فقیہ کا مخدوش ہونا ہے۔

☆ - دوسرے یہ کہ تحریک کے پلیٹ فارم سے منتخب ہونے والے اور ان کے علاوہ منتخب ہونے والے' دونوں ہی کی پالیسیاں یکساں ہیں۔ خاص طور پر آغاخانیوں کے بارے میں اور اس کی وجہ علاوہ اس کے اور کوئی نہیں کہ ان ممبران میں مذہبی حوالہ سے تربیت کا فقدان ہے اور انہیں مذہبی تغذیہ کی ضرورت ہے۔

روایتی سیاسی اسلوب جس پر اب تک پاکستان کے شیعہ عمائدین کاربند ہیں 'مکتب اہل بیت' اور اس کے ماننے والوں کے کسی درد کی دوا نہیں' البتہ مشکلات میں اضافہ کا ذریعہ ضرور ہے۔ لہٰذا تشیع کی پاسداری' سربلندی اور غلبہ کے لئے نظریاتی اساس پر مبنی ایک نئے اسلوب سیاست' نئی سوچ اور نئی سیاسی قیادت کے بیج بونے کی ضرورت ہے۔

پاکستان میں فرقہ واریت

موسس و بانی انقلاب اسلامی حضرت امام خمینی قدس سرہ نے انقلاب ایران کی کامیابی کے فوراً بعد ہی صدور انقلاب کی صدا بلند کی' جس کا مقصد دوسرے اسلامی ممالک میں بھی حکومت اسلامی کے قیام کے ذریعہ ایک متحدہ اسلامی بلاک کی تشکیل تھا تاکہ ان ممالک سے اسلام دشمن استعماری طاقتوں

کے ہاتھ قطع کئے جاسکیں۔

عالمی استعمار اور ان کے سرخیل امریکہ نے اس خطرے کو بھانپتے ہوئے انقلاب اسلامی ایران کو ایران کی سرحدوں تک محدود کر دینے بلکہ وہاں بھی اسے ناکام کرنے کے لئے منصوبہ بندیاں کیں۔ ان منصوبوں میں سے اس کا ایک موثر حربہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان نفرتوں اور عداوتوں کی آگ بھڑکا کر اسے مسلسل ہوا دینا تھا۔

انقلاب کے خلاف یہ سازش غیر متوقع نہ تھی، لیکن پاکستان میں انقلاب دوست عناصر ان سازشوں کے تدارک سے عاجز رہے، کبھی ان کے ازالہ کے لئے سنجیدہ کوششیں نہ کیں، بلکہ ایسے بے ڈھنگے طریقوں سے ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی کہ استعمار کی لگائی ہوئی یہ آگ مزید بھڑک اٹھی۔

ہم اس سلسلہ میں گفتگو کو طول دے کر تلخی پیدا کرنا نہیں چاہتے، لیکن بجا طور پر یہ کہیں گے کہ پاکستان میں ایسے عناصر جنہیں ہماری طرف سے نوازا گیا، ان کے کرتوتوں کے باوجود برادران اہل سنت کے مذہبی رہنماؤں نے صورت حال کو بگڑنے سے بچایا اور انتہائی نامساعد حالات میں بھی شیعوں کے کفر کا انکار کیا اور یہ بات اپنی جگہ شیعیت کے فروغ اور اسلامی اتحاد کے قیام کے سلسلے میں ایک روشن پہلو رکھتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ فرقہ واریت گروہوں کی صورت میں باقی ہے لیکن فرقوں کے لوگ باہم ایک دوسرے سے متنفر نظر نہیں آتے۔ بہرحال اس سلسلے میں بھی ہمیں اپنی کوتاہیوں کا اقرار کرنا چاہئے اور ان کی تلافی کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

یہاں تک ہم نے جو گفتگو کی اور جس صورت حال کی نشاندہی کی، اس کے ذمہ دار پاکستان کے شیعہ عمائدین اور ارباب حل و عقد تھے۔ اب ہم پاکستان میں موجود ایرانی اداروں کے کردار کے بارے میں کچھ گفتگو کریں گے۔

مختلف اسباب و حقائق کی بنا پر ہم خود کو یہ کہنے میں حق بجانب سمجھتے ہیں کہ جمہوری اسلامی کے نمائندین کی جانب سے اعلان کردہ پالیسیوں اور پاکستان میں موجود ایرانی مسئولین کے کردار میں فرق و اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایران میں معیار مطلوب کو پیش نظر رکھ کر اس کے حصول کے لئے سنجیدہ کوششیں نظر آتی ہیں اور بہتر سے بہترین کے لئے تگ و دو دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا الحمد للہ "کل یوم فی شان" ہے۔

لیکن پاکستان میں موجود ایرانی مسئولین کے بارے میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے وہاں اسلام ناب محمدی جس کے اس دور میں امام خمینیؒ علم بردار تھے، اس کے بجائے پاکستان کے موجودہ حالات کی بقا اور انہیں تقویت پہنچانے ہی کو اپنی ذمہ داری قرار دے لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں موجود ایرانی اداروں میں سیاست و مصلحت کے نام پر متدین پر غیر متدین افراد کو، عالم پر غیر عالم کو اور دینی اقدار کا احترام کرنے والوں پر لادینیت کا پرچار کرنے والوں کو اہمیت دینے کا رجحان عام نظر آتا ہے۔

ہم سفارت اور سفارتی نمائندوں کی بات نہیں کرتے، ممکن ہے ان کی سیاست ہماری سمجھ سے بالا ہو اور ان کی حکمت عملیاں تغیر کا شکار رہتی ہوں۔ لیکن خانہ ہائے فرہنگ جن کی ذمہ داری واضح ہے اور جن کا مقصد اسلامی ثقافت کا فروغ ہے، وہ اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے گامزن نہیں۔ ہم محض اس بنا پر ان پر تنقید سے پرہیز کرتے ہیں کہ کہیں اسے انقلاب اسلامی کی مخالفت نہ سمجھا جائے۔ لیکن اگر حقیقت حال کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان مراکز کی طرف سے فروغ اسلام کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے بلکہ ایران شناسی اور فارسی زبان و ادب کے فروغ کو فوقیت دی گئی ہے۔ ان کے کتب خانے ادبی مواد سے تو بھرے پڑے ہیں لیکن اسلام شناسی پر مبنی کتب ناپید ہیں۔

اس مجموعی صورت حال کے جائزے کے بعد اب اس کے ازالہ کے لئے بعض تجاویز پیش خدمت ہیں۔

(۱) ۔ فکر تشیع کی ترویج کو اولین اہمیت دی جائے' اس کی تعلیم و تدریس کا مناسب انتظام کیا جائے اور اس کے حامل افراد کو جذب کر کے ان کی توانائیوں سے استفادہ کیا جائے۔

(۲) ۔ منصوبہ بندی کے ساتھ شیعوں کی بڑی بڑی آبادیاں قائم کی جائیں۔

(۳)۔ شیعوں میں اسلامی' الٰہی نظام کے نفاذ کے ہدف سے وابستگی پیدا کی جائے۔ کیونکہ ایک طرف تو یہ انبیاءؑ و ائمہؑ کا نصب العین تھا' جس سے وفا شیعوں کے فریضے میں شمار ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ بات اہل سنت کے مذہبی حلقوں کو مطمئن کرنے کا بھی موجب ہوگی اور شدت پسندوں کے ہاتھ سے شیعوں کی مخالفت کا ایک ہتھیار چھین لے گی۔

(۴) ۔ پاکستان میں اس وقت جو انتخابی نظام رائج ہے اس کے ہوتے ہوئے شیعہ کبھی بھی موثر سیاسی کردار ادا نہیں کر سکتے' لہٰذا اگر متناسب نمائندگی کے تحت انتخاب کا مطالبہ کیا جائے' جس کے لئے عمومی رائے عامہ بھی ہموار ہے اور بعض بڑی سیاسی پارٹیوں کا مطالبہ بھی ہے تو اس صورت میں شیعہ اپنی حقیقی آبادی کے تناسب سے پارلیمنٹ میں نشستیں حاصل کر کے موثر سیاسی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

(۵) ۔ حوزہ علمیہ جائے آگہی سیاست ہے' نہ کہ سیاست کا عملی میدان۔ یہاں طالب علموں کو اسلامی سیاست کے اسلوب سیکھنے چاہئیں اور اپنے وطن کے لئے ائمہؑ کے سیاسی لائحہ عمل سے حکمت عملی اخذ کر کے موثر تجاویز دینے تک اپنے آپ کو محدود رکھنا چاہئے۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں موجود پاکستانی طلباء عملی سیاست کے میدان میں گروہ بندیوں میں مبتلا ہیں۔ اس صورت حال کا تدارک ہونا چاہئے۔

آخر میں ہم مجمع جہانی اہل بیتؑ کے دبیر محترم آیت اللہ محمد علی تسخیری کے شکرگزار ہیں کہ انھوں نے ہمیں اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی اور اپنی معروضات پیش کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اور علماء اور بزرگان سے اپنی تلخ گوئی پر معذرت خواہ ہیں، خصوصاً اپنے وطن پاکستان کے شیعہ ارباب حل و عقد سے معذرت طلب کرتے ہیں کہ ممکن ہے ہماری باتوں سے ان کی دل شکنی ہوئی ہو۔

ہمارے دینی مدارس۔ اور ہمارا معاشرہ۔

فاصلے کیوں؟

صدر مجلس، مہمانان خصوصی اور معزز شرکاء اجتماع !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سب سے پہلے تو میں مرکز علوم اسلامی کی باوقار و پرشکوہ عمارت کی تعمیر اور اس مرکز کو ایک جید عالم دین اور تجربہ کار مدرس کی سرپرستی میں دینے پر یہاں کی انتظامیہ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی دعا گو ہوں کہ 'خدا اس مرکز کی اس کے اعلیٰ اہداف کے حصول کیلئے مدد فرمائے اور جس طرح یہ ظاہری طور پر شان و شکوت کا حامل ہے اسی طرح اس کی معنوی حیثیت کو بھی بلند وبالا فرمائے۔ (آمین بحق محمد و آل محمد)

آج میں اپنی گفتگو کو ایک تمثیل کے انداز میں پیش کروں گا' ایک ایسی تمثیل جس میں غور و فکر کے بہت سے پہلو موجود ہیں' علماء کرام کیلئے بھی' دردمند دینی عناصر کیلئے بھی' صاحب ثروت اہل دین کیلئے بھی اور قوم کی مقتدر شخصیات کیلئے بھی۔ یہ تمثیل محض ایک فرضیہ نہیں بلکہ گوناگوں حقائق سے پر ہے۔

آیئے سنئے اور غور کیجئے۔

میں نے عمر کا ایک حصہ دینی مدارس میں گزارا ہے۔ آج میں ایک عالم دین کی حیثیت سے معاشرے کے درمیان ہوں اور اس حقیقت کے روبرو ہوں کہ ہمارے دینی مدارس اور ہمارا معاشرہ باہم کس قدر فاصلے پر ہیں۔ دونوں کے درمیان کتنی بڑی خلیج حائل ہے۔

میرا زیادہ سروکار اس وقت معاشرہ سے ہے۔ مدرسے سے ایک حد تک دور ہوں۔ اس لئے نہیں جانتا کہ وہاں کیا پیچیدگیاں ہیں۔ ان کی کیا مشکلات و مسائل ہیں۔ اس وقت میرے کام کا بڑا حصہ نشرواشاعت سے مربوط ہے۔ اس کے بارے میں کسی حد تک معلومات رکھتا ہوں۔ اس میدان کی مشکلات سے آگاہ ہوں۔ ان مشکلات کی وضاحت کیلئے نہ میرے پاس مناسب الفاظ ہیں اور نہ یہ محفل ان مشکلات کے بیان کیلئے موزوں ہے۔

اگر میں معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے مدارس پر انگشت نمائی کروں تو شاید صاحبان مدرسہ اور مدارس کے منتظمین کو یہ باتیں گوارا نہ ہو اور وہ مجھے یہ کہتے ہوئے روک دیں کہ یہ آپ کا شعبہ نہیں۔ آپ تصنیف و تالیف، نشرو اشاعت سے غرض رکھیئے۔ مدارس کی مشکلات سے آپ آگاہ نہیں اس لیئے ان پر تنقید سے باز رہئے۔

بہرحال میرا ارادہ، مدارس سے مربوط مسائل پر گفتگو کا نہیں لیکن اس حقیقت سے مفر نہیں اور کوئی اس کا انکار نہیں کرسکتا کہ ہمارے دینی مدارس اور ہمارے معاشرے کے درمیان فاصلے موجود ہیں اور یہ کہ یہ فاصلے دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتے جارہے ہیں۔

اسی ادراک حقیقت کے پیش نظر مدارس کے منتظم علماء کرام نے ان فاصلوں کو کم کرنے کی کوششیں بھی کیں اور اس کے طریقہ علاج بھی دریافت کرنے کے لئے کوشاں رہے لیکن بقول شاعر:

"مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"

یہ مرض کیوں بڑھتا گیا۔ یا تو مرض ہی لاعلاج ہو چکا ہے یا پھر معالج سے کہیں چوک ہو گئی ہے۔

ہاں معالج نے مرض کے اصل سبب ہی پر توجہ نہیں دی۔ سبب کیا ہے؟

دینی مدارس اور معاشرے کے درمیان فاصلہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ قدیم ایام ہی سے یہ فاصلہ موجود ہے۔ آیئے اس فاصلے کا سبب دریافت کرتے ہیں۔

میں نے مدرسے میں صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی۔ منطق کے چند مسائل سمجھنے کیلئے ہفتوں محنت کی۔ فلسفہ جیسے مشکل مضمون کا سطحی انداز سے مطالعہ کیا۔ گو کہ میرے دوسرے ساتھیوں نے اس مضمون میں بہت وقت اور عرق ریزی کا مظاہرہ کیا۔

فقہ میں قاعدہ طہارت، قاعدہ حلیت اور قاعدہ استعال کا مطالعہ کیا۔

اصول میں استصحاب اور قاعدہ برات کا مطالعہ کیا۔ حجیت ظن اور حجیت قطع کو پڑھا۔

ان علوم کی دس بارہ سال تحصیل کے بعد بزعم خویش خو کو ایک عالم ربانی اور طبیب روحانی سمجھ کر معاشرے میں داخل ہوا۔

میں نے اپنا پہلا قدم مسجد میں رکھا۔ یہاں لوگوں نے مجھ سے فقہی مسائل دریافت کئے۔ میں خاموش رہا۔ کیونکہ میں ان مسائل کے متعلق کچھ جانتا ہی نہ تھا۔

مجتہد کے رسالہ عملیہ کا میں نے مطالعہ ہی نہ کیا تھا۔ مدرسین نے مجھے اس کا موقع ہی نہ دیا تھا۔

دین کی ایک عظیم خدمت "منبر حسینؑ" کے ذریعہ کی جاسکتی ہے۔ لوگ مجلس ذوق و شوق سے سننے آتے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ ہمارے یہاں جو رہا سہا دین ہے، یا دین کے متعلق جو تھوڑی بہت معلومات ہیں وہ اسی منبر کے طفیل ہے۔

لیکن منبر پر بھی میں کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ میں فن خطابت سے سراسر نابلد اور لوگوں تک اپنی بات پہنچانے کے طریقوں سے ناواقف تھا۔

اب مجھے احساس ہوا کہ میں جو متع معاشرے کے لئے لے کر آیا تھا وہ کسی تاجر کے اس مال کی مانند ہے جس کا کوئی طلبگار اور خریدار نہ ہو۔ مجھے اپنا حال یوں محسوس ہوا جیسے اس دکاندار کا ہوتا ہے کہ جس نے دکان کو خوب سجا و سنوار کر' اس کی خوب پبلسٹی کر کے لوگوں کو اسکی طرف متوجہ کیا ہو لیکن جب لوگ دکان میں داخل ہوئے ہوں تو انہیں وہاں اپنے مطلب کی کوئی چیز نظر نہ آئی ہو۔ میں نے بھی خود کو عبا' قبا اور عمامے کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ نام کے آگے پیچھے القاب لگا کر زبان حال سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ میں آپ کے دنیاوی و اخروی' گھریلو و خاندانی' معاشی و معاشرتی مسائل کا حل لایا ہوں۔ لیکن بدقسمتی !!! کہ جب لوگوں نے مجھ سے رجوع کیا تو میں نے انہیں نامانوس فقہی و فلسفی اصطلاحات کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کی لیکن ان باتوں میں ان کے سوال کا جواب نہ تھا۔

جب وہ کہتے کہ قبلہ اگر آپ کے پاس اس کا جواب نہیں تو ہمیں بتایئے کہ کہاں جائیں؟ تو میں جواب دیتا کہ خبردار اونچی آواز سے بات نہ کرو' تمہیں عالم کی عزت کا خیال نہیں' تمہیں علم کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں !

پھر مجھے احساس ہوا کہ شاید یہ لوگ دینی اصطلاحات سے نامانوس ہونے کی بناء پر میری بات سمجھ نہیں پاتے لہٰذا دینی مدارس کا جال پھیلا دیا جائے۔ جگہ جگہ دینی مدارس قائم کئے جانے چاہئیں۔ یہ کام بھی کیا گیا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات' فاصلے جوں کے توں رہے۔

دوسری جانب' سیاسی نشیب و فراز' اقتصادی مشکلات عام آدمی کو دین کی جانب توجہ کا موقع ہی نہیں دے رہیں۔ بلکہ اس کے علی الرغم ایک طبقہ مسلسل انہیں یہ باور کرانے میں مصروف ہے کہ دین تمہاری زندگی کی پیچیدگیوں کے حل

سے عاجز ہے۔ تمہارے مسائل کا حل ان علماء کے بس کی بات نہیں۔

یہ طرز فکر اس صورتحال کا سبب ہوگا کہ جس سے چند صدیوں قبل کلیسا دوچار ہوا اور اس اعلان پر مجبور ہوا کہ دین اور زندگی دو جدا جدا چیزیں ہیں۔ دین محض چند عبادی رسومات کا نام ہے جو انسان رب العالمین کے حضور میں انجام دیتا ہے۔ اس کا انسانی زندگی اور اس میں پیش آنے والے روزمرہ مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔

ہمارے یہاں یہ طرز فکر اس لئے تاحال مقبولیت عامہ حاصل نہیں کرسکا کہ ابھی لوگوں میں دین کے ساتھ جذباتی تعلق باقی ہے اور لوگ قلبی طور پر آج بھی اس عقیدے کے قائل ہیں کہ دین انسانی زندگی کے تمام مسائل کے حل پر قادر ہے۔ لیکن اگر انہیں لوگوں کی عملی زندگی کا مشاہدہ کیا جائے تو اس نظریہ اور ان کے عمل میں دوئی نظر آتی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کی وجہ بھی بظاہر ہمارے دینی حلقے ہیں، کیونکہ وہ آج تک اسلام کو بطور نظام زندگی پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ ہر خشک و تر کا علم قرآن میں موجود ہے۔ لیکن جب جدید علوم سے بہرہ ور کوئی شخص ان سے سوال کرتا ہے کہ ہمارے فلاں معاشرتی مسئلہ کا حل قرآن میں کہاں موجود ہے، فلاں اقتصادی مسئلہ کا قرآن میں کہاں تذکرہ ہے تو وہ جواب سے عاجز نظر آتے ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟

ایسا اس لئے ہے کہ ہم نے مدارس میں تفسیر قرآن کو رواج ہی نہیں دیا۔ ہمارا سارا زور صدیہ، سیوطی اور حاشیہ پر رہا۔ پھر مدرسے سے نکلتے ہی عملی زندگی کی تگ و دو نے مطالعہ کی فرصت ہی نہ دی۔

ہم دوبارہ اپنے اصل موضوع یعنی "دینی مدارس اور ہمارے معاشرے کے درمیان موجود فاصلے" پر آتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ اس

فاصلے کو کم کرنے کے سلسلہ میں بھی جو کوششیں کی گئیں وہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو پائیں کیونکہ ان سے قبل مسئلہ کے اہم پہلوؤں کا جائزہ نہیں لیا گیا تھا۔

بعض حضرات کا خیال تھا کہ اس فاصلے کی وجہ دینی طلباء کی دنیاوی علوم سے بے خبری ہے۔ لہٰذا دینی مدارس کے طلباء کو دنیاوی علوم میں بھی طاق کیا جائے۔ انہیں کالج یونیورسٹی کی تعلیم سے بھی بہرہ ور کیا جائے۔

لیکن اس کے نتیجے میں بقول شاعر !

"نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم"

نتیجہ یہ ہوا کہ دینی مدارس نے ہاسٹل کا روپ دھار لیا۔ ان طلباء کی تمام تر توجہ مروجہ تعلیم کی طرف ہو گئی اور دینی مدارس میں دینی تعلیم نے ضمنی حیثیت اختیار کر لی۔

ہماری بنیادی غلطی یہ رہی کہ ہم اس بات کا تعین نہ کر سکے کہ ہمیں دینی مدارس سے کیا کام لینا ہے۔

(۱) آیا ان کے ذریعے مذہبی اسکالرز پیدا کرنے ہیں کہ جو دین کے متعلق گہری معلومات رکھتے ہوں، غیروں کے سامنے اپنے مذہب کی حقانیت کو دلائل کے ساتھ پیش کر سکتے ہوں اور عوام الناس کے مسائل کا حل شرعی اصولوں کے مطابق پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

(۲) یا محض دین کی بنیادی باتوں سے آگاہ، ضروری دینی مسائل سے واقف اور زیادہ سے زیادہ باجماعت نماز کی امامت کے اہل افراد کی تربیت کرنا ہے۔

(۳) یا ایسے افراد کی تربیت کرنا مقصود ہے جو مختلف شعبہ ہائے حیات میں کارہائے نمایاں انجام دے کر ملت کے وقار کی بلندی کا باعث ہوں۔

ہم نے ان تینوں مقاصد کو خلط ملط کر دیا اور انہیں ایک ہی راستے سے حاصل کرنے کی کوشش کی جو مناسب نہیں۔

ایسے افراد کیلئے جو کارہائے نمایاں کے ذریعے ملت کا وقار بلند کریں علیحدہ تعلیمی ادارے قائم ہونا چاہئیں جہاں جدید علوم کی تعلیم کا بندوبست ہو اور جہاں دینیات کو ایک مضمون کے طور پر پڑھانے کا معقول انتظام ہو تاکہ ہر طالب علم مذہب کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ ہو اور اسلامی اخلاق سے بہرہ ور ہو۔ ایسے اداروں کے دلئے فنڈز بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوتا کیونکہ اخراجات کا ایک بڑا حصہ فیسوں کے ذریعہ پورا کیا جاسکتا ہے اور سماجی بہبود کے ایسے منصوبوں میں مخیر حضرات بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

بنیادی دینی تعلیم کیلئے علیحدہ ادارے تشکیل دیئے جائیں یا دینی مدارس ہی میں شام کے اوقات میں کلاسوں کا اہتمام کیا جائے جن میں عقائد، فقہ اور اخلاق پر مشتمل کورس پڑھائے جائیں۔

ہم نے گزشتہ سطور میں دینی مدارس سے فارغ ہونے والے طلباء کی معاشرے میں ناکامی کی وجوہ میں سے ایک بڑی وجہ ان کا معاشرے سے ناواقف ہونا اور جدید رجحانات سے نابلد ہونا بیان کی تھی۔ لیکن اس کا حل یہ نہیں کہ ہم دینی مدارس میں مروجہ تعلیم کا بھی اہتمام کریں کیونکہ یہ عملاً محال ہے کہ ایک ہی وقت میں دو مختلف نصاب پڑھائے جائیں اور پڑھنے والے دونوں میں مہارت حاصل کرلیں۔ اسی لیئے دنیا میں کہیں اس کی مثال موجود نہیں کہ کسی میڈیکل کالج کے طلباء کو انجنیئرنگ کی تعلیم بھی دی جاتی ہو یا کسی انجنیئرنگ کالج کے طلباء ساتھ ساتھ میڈیکل سائنس بھی پڑھتے ہوں۔ پھر ہم دینی مدارس کے طلباء سے اس انہونی کی توقع کیوں کریں؟

بلکہ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ ہم دینی مدارس کے نصاب کو نظرثانی کے بعد مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ مدارس میں کم از کم میٹرک یا انٹرپاس طلباء ہی کو داخلہ دیں کیونکہ یہ کسی حد تک معاشرے سے نزدیک ہونے کی وجہ سے جدید رجحانات سے بھی آگاہ ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں معاشرے میں سرگرم دینی قوتوں کے ساتھ مل کر ایسا لائحہ عمل بھی مرتب کیا جاسکتا ہے جس کے ذریعے معاشرے کے فعال اور دینی ذمہ داری کا احساس رکھنے والے افراد کو دینی مدارس میں لایا جاسکے۔

تجاویز

مدارس کی موجودہ صورت حال اور معاشرے کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے دینی مدارس کی اصلاح کیلئے چند تجاویز حاضر خدمت ہیں:۔

(۱) ہمارے مدارس میں عقائد کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں۔ اگر کہیں بندوبست ہے بھی تو وہ روایتی بنیادوں پر ہوتا ہے جو طلباء کے اذہان میں ٹھوس اسلامی عقائد کو مرتسم نہیں کرپاتا۔ لہٰذا جب طالب علم معاشرے میں داخل ہوتا ہے تو وہاں موجود خرافات کے سامنے کوئی واضح موقف نہیں رکھتا بلکہ انہی کے سامنے سرتسلیم خم کردیتا ہے جبکہ شخصیت کی تعمیر میں عقائد کی بنیادی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ عقائد ہی سے اخلاق و آداب اور طرز حیات سرچشمہ لیتے ہیں۔

لہٰذا مدارس میں سادہ انداز میں علمی و فلسفی بنیادوں پر عقائد کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ ساتھ ہی دوسرے اسلامی فرقوں کے عقائد اور مادی مکاتب کے ساتھ 'مکتب اہل بیتؑ' کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔

(۲) قرآن جو اسلامی شریعت کا مصدر اول ہے' اس کی تعلیم سے بھی مدارس میں بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ لہٰذا مدارس میں باقاعدہ تفسیر قرآن کے دروس کا اہتمام کیا جائے تاکہ طلباء قرآنی علوم و معارف سے بہرہ ور ہو سکیں۔

(۳) اسلامی اقتصاد اور دوسرے اقتصادی نظاموں کے تقابلی مطالعہ پر مشتمل مضامین کی بھی تعلیم دی جائے۔

(۴) دین اور سیاست کا لاینفک تعلق آج محتاج بیان نہیں۔ اسلام کا نظام

حیات کی حیثیت سے نفاذ اسلامی سیاست کی بالادستی میں مضمر ہے۔ لہٰذا اسلامی سیاست کے اصولوں کی تعلیم اور غیر اسلامی سیاست سے اس کا تقابلی مطالعہ بھی مدارس کے نصاب میں شامل ہونا چاہیے تاکہ طلباء عملی میدان میں اسلامی اور غیر اسلامی سیاست میں تمیز روا رکھ سکیں اور معاشرے میں رائج سیاسی داؤ پیچ ہی کو اسلامی سیاست نہ سمجھنے لگیں۔ جیسا کہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ مروجہ سیاست کو دینی فریضے کے بطور لیتے ہیں جو کہ سراسر غلط ہے۔ پھر چونکہ انہوں نے مروجہ سیاست کا بھی مطالعہ نہیں کیا ہوتا لہٰذا اس میں بھی ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں۔

(۵) بقول مولا امیرالمومنین "انسانی نفس سرکش اونٹ کی مانند ہے۔ اگر اس کی مہار کو چھوڑ دیا جائے تو وہ سوار کو گرا دے گا۔"

انسانی نفس ۷۵٪ (پچھتر فی صد) دنیا کی جانب مائل ہوتا ہے۔ کبھی اسے خاندان اور اہل و عیال کی محبت دنیا کی طرف راغب کرتی ہے تو کبھی معاشی و اقتصادی مسائل پریشان کرتے ہیں۔ لہٰذا نفس اسے دنیا کی طرف دھکیلتا ہے اور اگر انسان ہفتوں، مہینوں وعظ و نصیحت کی محافل سے دور رہے، موت کا تذکرہ نہ سنے اور قیامت اور روز جزا کی باتیں اس کی سماعت سے نہ ٹکرائیں تو ایک طرح کی قساوت قلبی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی حال دینی طلباء کا بھی ہے۔ شروع شروع میں تو ان کے ذہن خدا کی جانب مائل رہتے ہیں لیکن جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ان میں یہ جذبہ سرد پڑنے لگتا ہے۔ چنانچہ طلباء کے ضمیر و وجدان کو غذائیت فراہم کرنے اور انہیں خدا کی جانب متوجہ کرنے کی غرض سے کم از کم ہفتہ وار درس اخلاق کا بندوبست کیا جائے۔

(۶) مدارس میں عربی زبان کی تدریس کیلئے حماسہ یا تعلیم لغت عربیہ جیسی کتب مستعمل ہیں، جن کے ذریعے محض عربی زبان و ادب سے واقفیت ہوتی ہے۔ اگر ان کتب کے بجائے نہج البلاغہ کے مختصر کلمات اور غرر الحکم وغیرہ جیسی کتب عربی

میں پڑھائی جائیں یا قرآن کے چھوٹے سورے پڑھا کر ان کی گرامر کے ذریعہ عربی کی تعلیم دی جائے تو یہ عمل "ایک پنتھ دو کاج" کی مصداق ہوگا۔

اس طرح طلباء کو نہ صرف عربی زبان و ادب سے واقفیت ہوگی بلکہ وہ ساتھ ساتھ معارف دینی سے بھی آشنا ہوں گے۔

یہی طریقہ کار فارسی زبان کی تدریس کیلئے بھی اپنایا جائے۔

(۷) اپنی بات لوگوں تک مؤثر انداز میں پہنچانے اور انہیں اپنے موقف پر قائل کرنے کیلئے طرز بیان اور فن خطابت کا جاننا بہت ضروری ہے۔ لہذا کوئی مبلغ، عالم دین اور سیاسی رہنما خطابت سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ خداوند عالم رسول کریمؐ پر اپنے جن احسانات کا تذکرہ کرتا ہے ان میں سے ایک "عمدہ انداز بیان" بھی ہے۔

آنحضرتؐ کے انداز بیان اور آپؐ کی فصاحت و بلاغت کی تعریف کرتے ہوئے میدان خطابت کے شہسوار امیرالمومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:-

"جو پیغمبرؐ جیسے فصیح و بلیغ بیان کو نہ سمجھ سکے ہوں انہیں میرا بیان کیا سمجھ میں آئے گا۔"

علماء دین کیلئے خطابت کی اس قدر اہمیت کے باوجود ہمارے مدارس میں یہ فن سکھانے پر بالکل توجہ نہیں دی جاتی۔ اس کی وجہ یا تو مدرسین اور مدارس کے منتظمین کی اس فن کی اہمیت سے ناواقفیت ہے یا پھر وہ اسے سکھانے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ جس کی وجہ سے ان مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ معاشرے میں موجود معروف خطیبوں اور مقرروں کی نقل کرنے لگتے ہیں اور یوں مدرسے کی تربیت اور پیشہ ور خطیبوں کا سا انداز ایک غیر متوازن صورت اختیار کر لیتا ہے۔

پھر یہی نہیں بلکہ اس صورت حال کی بنا پر دین و ملت مسلسل ایک عظیم نقصان سے دوچار ہے اور قوم کی دولت و ثروت خسارے کا شکار ہے۔ منبر حسینی

پر دین و شریعت سے بے بہرہ خطیبوں کی اکثریت کے چھا جانے کی وجہ سے مجالس حسینؑ بجائے اس کے کہ مذہب کیلئے مفید ثابت ہوں اور ان کے ذریعے ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل عمل میں آئے' قوم و مذہب کیلئے باعث تخریب بنتی جا رہی ہیں۔

ہر سال عزاداری کی رسومات پر بے پناہ دولت صرف ہوتی ہے لیکن اگر ٹھنڈے دل و دماغ سے جائزہ لیا جائے تو دین کا گراف مسلسل رو بہ زوال ہے۔ اگر مدارس کے منتظمین ناراض نہ ہوں تو عرض کروں کہ اس صورتحال کی جس قدر ذمہ داری منابر حسینؑ پر قابض نااہل خطیبوں کی ہے اس سے کچھ کم ذمہ داری آپ پر عائد نہیں ہوتی۔ اگر منابر حسینؑ سے مدارس کے فارغ التحصیل علماء خطاب فرماتے تو یقیناً آج صورت حال مختلف ہوتی۔

لہٰذا ہماری تجویز ہے کہ دینی مدارس میں خطباء کی تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم اور نہج البلاغہ کے طرز تخاطب اور اردو ادب سے مدد لی جا سکتی ہے۔

(۸) آخر میں ہماری تجویز ہے کہ مدارس دینی کے طلباء کو صرف دینی علوم کی تعلیم دی جائے۔ عرصہ تعلیم میں انہیں مروجہ تعلیم کی خواہ وہ پرائیویٹ امتحان دینے کی حد تک ہی کیوں نہ ہو' بالکل اجازت نہ دی جائے تاکہ وہ یکسوئی کے ساتھ دینی علوم کے حصول پر توجہ مرکوز رکھ سکیں۔

ہماری مذکورہ معروضات کسی بھی صورت میں حتمی اور آخری نہیں۔ بہرحال انہیں دینی مدارس کی اصلاح کی راہ میں ایک قدم قرار دیا جا سکتا ہے۔

معزز علماء کرام اور ذمہ داران قوم ان کی روشنی میں مزید غور و تحقیق کے بعد ایک بہترین لائحہ عمل مرتب کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک سالانہ سیمینار کا اہتمام بھی کیا جا سکتا ہے جس میں یہ افراد بیٹھ کر مدارس کی سال بھر کی کارکردگی پیش کریں۔ اس کے بعد اس پر بے لاگ تبصرہ کیا جائے اور اگر

خامیاں پائی جائیں تو ان کے ازالہ کیلئے اقدامات تجویز کئے جائیں تاکہ ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں ہمارے مدارس بھرپور کردار ادا کرسکیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۸/ شوال ۱۴۱۳ھ

۱۱/ اپریل ۱۹۹۳ء

اتحادِ مسلمین کی کوششوں کی ناکامی

کے اسباب

سامعین گرامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس سیمینار میں ہم بانیان وحدت اسلامی کی فہرست دہرانا نہیں چاہتے اور نہ ان حضرات کی کوششوں کی ماضی کی داستانوں کی مانند تکرار کرنا چاہتے ہیں نہ ہی ہم اتحاد مسلمین کی راہ میں حائل رکاوٹوں کی ذمہ داری سیمینار ہال سے باہر کسی پر لگانا چاہتے ہیں جیسا کہ حزب مخالف تمام ناکامیوں کی ذمہ داری حکمرانوں پر اور حکمراں تمام مسائل کی ذمہ داری حزب مخالف پر ڈالتے ہیں اور یوں ہر ایک اپنی خامیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔

بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ سنجیدگی کے ساتھ اس ناکامی کے اسباب کا جائزہ لیں خواہ اس کے ذمہ دار ہم خود قرار پائیں یا کوئی اور۔

اگر ہم اتحاد اسلامی کو ایک ناگزیر ضرورت سمجھتے ہیں' اسے مسلمانوں کی مشکلات کا حل خیال کرتے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ حقائق کی روشنی میں مسئلہ کا جائزہ لیں۔

اتحاد اسلامی کے سلسلے میں ناکامی کی وجوہ کو ایک یا دو اسباب میں منحصر کرنا

ناانصافی ہوگی۔ ناکامی کے متعدد اسباب ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ کوئی سبب زیادہ ضرر رساں رہا ہو اور کوئی کم۔

یہاں ہم سامعین کے سامنے ناکامی کے اسباب کی ایک مختصر فہرست اس امید کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کیا جائے گا۔

(۱) عملی اقدامات کا نہ ہونا

اسلامی اتحاد کی فکر مفکرین کے ذہنوں اور فکری اجتماعات سے باہر نہ نکل سکی۔ اس بارے میں ہم گزشتہ دور کے داعیان وحدت کو تنقید کا نشانہ نہیں بناتے۔ ممکن ہے عملی اقدامات کے سلسلہ میں ان کیلئے فضا تنگ ہو، حالات سازگار نہ ہوں لیکن حضرت امام خمینیؒ کی زیر قیادت برپا ہونے والے اسلامی انقلاب ایران کے بعد اسلامی اتحاد کی فضا سازگار ہوئی تھی اور رائے عامہ تیار ہوئی تھی۔ ہر شخص اور گروہ، مسلمانوں کے مابین اتحاد کے قیام کو ایک مستحسن عمل قرار دیتا تھا اور کسی طرف سے بھی اُس کی علانیہ مخالفت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ان موافق حالات کے باوجود تا ہنوز یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور اسلامی اتحاد کا نظریہ ذہنوں سے نکل کر جامہ عمل نہ پہن سکا۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جو نظریہ محض فکروں تک محدود رہے، اس کے لئے رائے عامہ ہموار نہ ہو اور لوگ اس پر عمل پیرا نہ ہوں تو وہ نظریہ ذہنوں میں محدود ہو کر معدوم ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس سے کسی نتیجہ کی توقع رکھنا عبث ہے۔

(۲) عوام کو آمادہ نہیں کیا گیا۔

ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی کو سولہ سال ہو چکے ہیں۔ اس عرصہ میں ملک کے گوشہ و کنار میں اسلامی اتحاد کے عنوان پر بکثرت سیمینار، کانفرنسیں اور جلسے ہوئے جن میں شیعہ سنی علماء کرام اور سماجی شخصیات نے اس

موضوع پر خطابت کے جوہر دکھائے 'گرانقدر مقالات پیش کئے اور کتب تالیف کی گئیں لیکن ہم پھر یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ مقررین کے گرانقدر خیالات اور اسلامی اتحاد کیلئے ان کی تڑپ محض سیمینار ہال یا جلسہ گاہ ہی تک محدود رہی۔ کسی بھی فرقے کے علماء نے اپنے مخصوص اجتماعات میں لوگوں کو اسلامی اتحاد کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے پر عملی طور پر آمادہ نہیں کیا۔

ہم اس بات کے معترف ہیں کہ یہ علماء کرام خود اسلامی اتحاد کے نظریہ پر پختہ یقین رکھتے ہیں لیکن عوام الناس کو اس بارے میں عملی اقدامات پر ابھارنے کی جرات نہیں کرپاتے۔ اگر اس جرات کا فقدان نہ ہوتا اور شیعہ علماء شیعہ اجتماعات میں اور اہل سنت علماء اہل سنت کے اجتماعات میں اپنے عوام کو اتحاد کے قیام کی تلقین کرتے تو آج صورتحال یقیناً مختلف ہوتی۔

(۳) مقدس ہدف معین نہیں کیا گیا

مسلمانوں کے مابین اتحاد و اتفاق کی بات کرنے والے بہت سے لوگوں اور اس سلسلہ میں تشکیل دیئے جانے والے بعض اجتماعات کا اصل مقصد اسلام کی سربلندی اور کفر و نفاق کی سرنگونی نہیں ہوتا بلکہ کبھی حزب اقتدار 'حزب مخالف کو کمزور کرنے کی غرض سے لوگوں کو اپنے زیر قیادت اتحاد کی دعوت دیتی نظر آتی ہے۔ اور کبھی حزب مخالف حکومت کے خلاف لوگوں کو اتحاد جیسے پاکیزہ نعرہ کے ذریعہ اپنے گرد اکٹھا کرتی ہے۔

اس کے علاوہ بعض وہ گروہ جن کا کوئی مقام و حیثیت نہیں اپنے گرد لوگوں کو جمع کرنے کیلئے اس نعرہ کو استعمال کرتے ہیں۔

لہٰذا ابھی تک اکثر مسلمانوں کے سامنے اتحاد کا مقصد و ہدف واضح نہیں۔

بعض لوگوں کے نزدیک وحدت کا مقصد بھائی چارے کا فروغ اور باہمی مفاد کیلئے رہن سہن کا نام ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ ہدف وہاں جاکر ختم ہوجاتا ہے جہاں بھائی چارے اور مشترکہ رہن سہن کی وجہ سے کسی کو نقصان

اٹھانا پڑے۔ چونکہ اس طرح کسی کو اتحاد کا کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اس لئے اتحاد کا قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔

بسا اوقات ' اہل مذہب کی مصلحت و منفعت کو اتحاد کا تقاضا قرار دیا جاتا ہے۔ مثلاً شیعہ قوم کی مصلحت یہ ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق قائم ہو یا مثلاً سنی قوم کی مصلحت اس میں ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد ہو۔ ان مصلحتوں کو بھی اتحاد کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ایک صورت تو یہ ہے کہ ممکن ہے قوم کی مصلحت ' عدم اتحاد میں ہو ' اس سے اس کے اداروں کو ترویج نفاق کیلئے امداد ملتی ہو ' اتحاد میں رکاوٹیں حائل کرنے پر اس کے افراد کو منصب و مقام سے نوازا جاتا ہو۔ لہذا اتحاد قومی مصلحت کی بنیاد بھی قرار نہیں پا سکتا۔ پھر چوں کہ اس کے پیچھے کوئی مضبوط فکری بنیاد بھی نہیں ہوتی اور محض وقتی مفادات کا حصول مطمع نظر ہوتا ہے ' اس لئے ممکن ہے کچھ عرصہ بعد جب یہ مفادات حاصل ہو جائیں تو اتحاد کی عمارت زمین بوس ہو جائے۔ مزید یہ کہ یہ بھی قومی بنیاد پر اتحاد ہے ' اس میں مذہب کا صرف نام استعمال ہوتا ہے۔

اتحاد کی محکم ترین بنیاد مذہب کی مصلحت اور دین کی منفعت بن سکتی ہے۔ شیعہ مذہب کی مصلحت ' مذہب کے فروغ اور اس بات میں پوشیدہ ہے کہ مذہب زندہ رہے۔ اسی طرح سنی مذہب کی بقاء بھی مذہب کے قوی ہونے میں ہے۔

نہ تو شیعہ مذہب کی مصلحت اس میں ہے کہ کوئی بے دین شیعہ حکمراں ہو اور نہ ہی کسی لادین سنی کا صاحب اقتدار ہونا مذہب اہل سنت کیلئے مفید ہے۔

اس بات کو نہایت صراحت کے ساتھ فیلسوف اسلام حضرت آیت اللہ شہید سید محمد باقر الصدر ؒ عراقی عوام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

"سنی حکومت وہ حکومت نہیں کہلائے گی جس کا حکمراں سنی ہو ' اسی طرح شیعہ حکومت وہ حکومت نہیں جس کا حکمراں شیعہ ہو۔"

بنا برایں دونوں فرقوں کی بقاء قرآن و اسلام کی حکومت میں مضمر ہے کیونکہ

مذہب کے سایہ میں قوم زندہ رہ سکتی ہے' قوم کے سائے میں مذہب نہیں۔

(۴) اس فکر کا ایک مخصوص طبقہ میں محدود ہونا

اسلامی اتحاد کے سلسلے میں اب تک جتنے سیمینار اور کانفرنسیں منعقد ہوئی ہیں ان میں خطیب اور مقالہ نگار حضرات معاشرے کے ایک خاص طبقہ ہی سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ کبھی یہ نہیں سوچا گیا کہ ایک ہی طبقہ پر انحصار اس نظریہ کے مقبول عام ہونے میں رکاوٹ ہے اور اس ضرورت کا ادراک نہیں کیا جاسکا کہ پورے معاشرہ میں اس فکر کی ترویج و قبولیت کیلئے مختلف طبقات کے لوگوں کو اس سلسلہ میں شریک کرنے کی ضرورت ہے۔

(۵) استعماری ہاتھ کی کارفرمائی

اگرچہ خلافت دولت عثمانیہ کے بعد اسلامی اتحاد کا نعرہ دشمنان اسلام کیلئے حساسیت کا حامل رہا لیکن اس کے غیر متوثر ہونے کی بناء پر رفتہ رفتہ ان کے نزدیک اس کی حساسیت میں کمی ہونے لگی۔ ممکن ہے نجی محفلوں میں وہ اس مسئلہ کو زیر بحث لاتے ہوں لیکن کھلم کھلا اس کی جانب سے فکرمندی کا اظہار نہ کرتے تھے۔ لیکن جب رہبر انقلاب اسلامی حضرت امام خمینیؒ نے اسلامی اتحاد کا نعرہ بلند کیا تو چونکہ یہ تنہا امام خمینیؒ کی آواز نہ تھی بلکہ اس کی پشت پناہ ایک قوم تھی' اس لئے اسلام دشمنوں کیلئے اس آواز کو دبانا ممکن نہ رہا۔ دردمند و باشعور مسلمانوں نے بلا تفریق فرقہ و مسلک اس آواز پر لبیک کہی۔ امام خمینیؒ نے محض زبانی دعوت پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ عملاً اتحاد کا حکم بھی دیا۔ مثلاً حج کے موقع پر مکہ میں جہاں دنیا کے گوشہ و کنار سے ہر رنگ و نسل اور ہر مسلک و مکتب کے مسلمان اکٹھا ہوتے ہیں' وہاں کے متعلق فرمایا کہ:۔

"اگر کوئی شخص وہاں جماعت سے احتراز کرتے ہوئے فرادی نماز پڑھے تو اس کی نماز میں اشکال ہے۔ نیز حرم کی جماعت میں شریک ہونا واجب

ہے اور اس کے علاوہ کوئی جماعت کھڑی کرنا حرام ہے۔"

امام خمینیؒ کے بلند کردہ اتحاد اسلامی کی اس آواز نے اسلام دشمن قوتوں پر جھنجلاہٹ طاری کردی اور وہ اپنے ناجائز مفادات کے تحفظ کیلئے اس نعرہ کے مقابل آکھڑے ہوئے اور بھرپور قوت کے ساتھ فرقہ واریت کے فروغ میں مشغول ہوگئے۔

حال حاضر میں فرقہ واریت کو ایک سازش سمجھنا اور اس کے نقصانات کا ادراک رکھنا غیر معمولی ذہانت کی علامت نہیں بلکہ معمولی ذہن رکھنے والے بھی یہ بات خوب اچھی طرح جانتے ہیں جبکہ اس کی روک تھام غیر معمولی اقدامات ذہنی صلاحیت اور جرائت کی متقاضی ہیں۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک عزیز میں فرقہ واریت کے خلاف سرگرم قوتیں نادانستہ طور پر اس کے فروغ کا سبب بنی ہوئی ہیں' اس آگ کو پانی سے بجھانے کی کوشش نہیں ہو رہی بلکہ پیٹرول سے سرد کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ فرقہ واریت کا علاج فرقہ پرستی میں تلاش کیا جارہا ہے۔

(٦) رکاوٹیں دور نہیں کی گئیں

اتحاد کے سلسلہ میں منعقد کئے جانے والے اجتماعات میں قرآن وسنت کی روشنی میں مسلمانوں کے اتحاد کی اہمیت' علماء اسلام کی اس سلسلہ میں تاکیدات اور اس بارے میں بانیان وحدت اسلامی کی کوششوں کے بارے میں تقاریر ہوتی ہیں' قراردادیں پیش کی جاتی ہیں اور اتحاد کے قیام کیلئے بھرپور کوششوں کا عزم کیا جاتا ہے لیکن آج تک کسی اجتماع میں یہ طے نہیں کیا گیا کہ آج سے تمام فرق' اتحاد کی راہ میں حائل فلاں فلاں رکاوٹوں کو دور کرنے پر اتفاق کرتے ہیں۔

(۷) نکتہ اشتراک۔ اسلامی حکومت کا قیام

اتحاد کیلئے کسی نکتہ اشتراک کی ضرورت بدیہی امر ہے' جسے سب تسلیم بھی کرتے ہیں۔ لیکن نکتہ اشتراک کے طور پر جن اصولوں و فروعات کو پیش کیا جاتا ہے' وہ اتحاد کیلئے کافی نہیں۔ ان میں مسلمانوں کو متحد کرنے کی طاقت و توانائی نہیں پائی جاتی۔ مثلاً حج و نماز ہی کو لے لیجئے جنہیں سب سے زیادہ بطور نکتہ اشتراک متعارف کرایا جاتا ہے لیکن اگر جائزہ لیں تو تمام فرقے اپنے اپنے طریقہ سے یہ عبادات انجام دیتے ہیں۔ لہذا یہ اتحاد کے لئے نکتہ اشتراک قرار نہیں پاسکتیں۔

ہمارے خیال میں اتحاد کیلئے محکم ترین نکتہ اشتراک "اسلامی نظام حکومت کا قیام ہے۔"

قرآن کریم انسانوں کیلئے دو ہی نظاموں کا تذکرہ کرتا ہے۔ ایک الہی نظام اور دوسرا نظام جاہلیت۔ جاہلیت خواہ قدیم پتھر کے دور کی ہو یا جدید ایٹمی دور کی' اسلام کی نظر میں دونوں ہی مردود ہیں۔ یہاں یہ بھی واضح کرتے چلیں کہ جاہلیت کسی خاص زمانہ اور جگہ میں منحصر نہیں اور محض اسلام سے قبل کے دور کو زمانہ جاہلیت نہیں کہا جاسکتا بلکہ قرآن کریم میں جاہلیت کی بعض علامات و نشانیاں بیان ہوئی ہیں۔ وہ علامات و نشانیاں کسی بھی دور میں' کسی بھی معاشرہ پر حاکم ہوں تو وہ دور اور معاشرہ جاہلیت سے موسوم کیا جائے گا۔ جاہلیت کا اعلی ترین مصداق دین کو اجتماع سے علیحدہ کرنا ہے۔ بالفاظ دیگر دین و سیاست میں جدائی ہے۔ دور حاضر میں اس کے لئے "سیکولرزم" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

حکومت الہی اور نظام اسلام کا مصدر قرآن کریم اور سنت نبوی ہے۔ گو ان دونوں مصادر کی تفصیلات میں بھی شیعہ اور سنی مکاتب فکر میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔ شیعہ' احادیث معصومین کو حجت قرار دیتے ہیں اور سنت کا حصہ

سمجھتے ہیں اور اہل سنت' اصحاب رسولؐ کے قول و قیاس کو میزان قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح دونوں مسالک کے درمیان آیات کی تفسیر میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔

لیکن اس اختلاف نظر کو تسلیم کرلینے کے باوجود بھی اگر کہیں واقعا اسلامی حکومت قائم ہو' خواہ وہ شیعہ علماء کے ہاتھوں وجود میں آئے یا سنی علماء کے' یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ وہاں دونوں فرقوں کے مورد اتفاق اسلام کے ایک بڑے حصہ پر عمل ہو رہا ہوگا۔

مثلاً اگر شیعہ علماء کی حکومت ہو تو وہاں رائج نظام میں آدھے سے زیادہ پر علماء اہل سنت متفق ہوں گے۔ اور اگر سنی علماء کی حکومت ہو تو وہاں رائج نظام میں آدھے سے زیادہ پر شیعہ متفق ہوں گے۔

مگر موجودہ صورت حال تو یہ ہے کہ تعصب کی بناء پر' فرقے پورے کی آرزو میں نصف سے دست بردار ہو کر سیکولرازم کے نفاذ کو ترجیح دیتے ہیں۔

دین کو سیاست سے جدا کر کے الٰہی خلافت و امامت کا استرداد دونوں مسالک (شیعہ و سنی) کے لئے چیلنج بنا ہوا ہے۔

آج اس بحث کا وقت نہیں کہ حاکم منصوص من اللہ ہونا ضروری ہے یا امت کی مرضی سے متعین ہوگا۔ اسی طرح یہ سوال کہ امامت' اصول دین میں ہے یا فروع دین میں ہے' آج چنداں اہم نہیں۔

اہل سنت کے یہاں حاکم و خلیفہ کا انتخاب' قدیم زمانہ سے ہی امت کے ذمہ رہا ہے۔ آج قرآن و شریعت اور امت موجود ہے لیکن صالح حاکم و خلیفہ نہیں پائے جاتے۔ اسی طرح مکتب اہل بیتؑ کے پیروکار جو امامت کیلئے نص الٰہی کے قائل ہیں اور صرف معصوم کی حکومت کو مشروع سمجھتے ہیں ان کے یہاں بھی امام آخرالزمانؑ کی غیبت کے دور میں ان کی جگہ حاکم کا تعین امت کے ذمہ ہے۔ لہٰذا آج دونوں ہی مسلکوں کے پیروکار ایک صالح رہبر و قائد کے انتخاب

کے ذمہ دار ہیں۔

اس نظریہ پر بھی تمام علماء اسلام (شیعہ و سنی) متفق ہیں کہ حکمران، اسلام شناس اور امین ہونا چاہئے۔ اگرچہ ولایت فقیہ کے سلسلہ میں علماء شیعہ میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے لیکن حکومت اسلامی کے لئے فضا سازگار ہونے کی صورت میں اس کے نفاذ کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف اس بارے میں ہے کہ اگر قیام حکومت کیلئے خون بہانا پڑے تو کیا یہ جائز ہے یا اس موقع پر انسان اپنی جان کی حفاظت کرے۔

حضرت امام خمینیؒ کا نظریہ ہے کہ:۔

"حکومت اسلامی کا قیام سب سے اہم فریضہ ہے اور کیونکہ تمام اصول و فروع کی بقاء، حکومت اسلامی سے وابستہ ہے اس لئے اس سلسلہ میں ہر قسم کی قربانی جائز ہے۔"

ہماری مطبوعات

حسینؑ شناسی
فکر حسینؑ کی الف، ب
صحیفہ وفا حضرت ابو الفضل العباسؑ
فلسفہ عزاداری و قیام امام حسینؑ
انقلاب حسینؑ
آمریت کے خلاف ائمہ طاہرینؑ کی جدوجہد
قیام امام حسینؑ کا جغرافیائی جائزہ
تفسیر سیاسی قیام امام حسینؑ
اصول عزاداری
مثالی عزاداری کیسے منائیں؟
عزاداری کیوں؟
تفسیر عاشورا
ائمہ معصومینؑ کی سیاسی زندگی کا تحقیقی جائزہ
سوانح حضرت امام حسینؑ
عاشورا اور خواتین
آداب اہل منبر
اہل بیتؑ کی زندگی کے مقاصد کی ہم آہنگی، زمانہ کی نیرنگی
پیام شہیدان

صدائے حضرت سجادؑ
عزاداری ایک تحقیقی جائزہ
حضرات حسینؑ
قیام مقدس امام حسینؑ غیر مسلمانوں کی نظر میں
خاک پر سجدہ، مقصد، اہمیت، حقیقت
آداب نماز
راز نماز
نماز کے ۱۱۳ نکتے
سوانح حضرت فاطمۃ الزہراؑ
فاطمہ زہراؑ اسلام کی مثالی خاتون
ازدواج در اسلام
اسلام میں خواتین کے حقوق
آسان مسائل
خاندان کا اخلاق
انسان کے کمال میں اخلاق کا کردار
عظیم لوگوں کی کامیابی کے راز
مقتل حسینؑ
اسلامی اقتصاد کا ایک جائزہ
ہماری ثقافت اور سیاست کیا ہے اور کیا ہونی چاہیے